www.urducouncil.nic.in
اکتوبر 2015، قیمت: -/10 روپے

ماھنامہ

بچوں کی دنیا

دھلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اُردو دُنیا
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے ، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سیمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

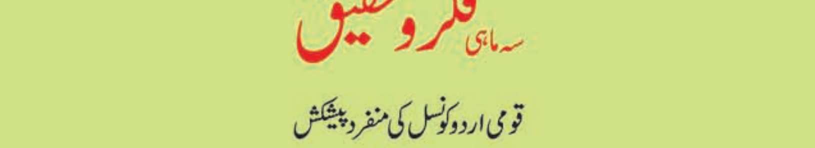

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکرانگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون:26109746، فیکس:26108159
E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

بچوں کی دنیا

جلد: 3 شمارہ: 10 اکتوبر 2015

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارتِ ترقی انسانی وسائل۔ محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،

جسولہ، نئی دہلی -110025

فون: 49539000

شعبہ ادارت: 49539009-11

ای میل

bachonkiduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10 روپے، سالانہ /100 روپے

▪ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت

ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم

نئی دہلی -110066

فون: 26109746

ای میل: sales@ncpul.in

ncpulsaleunit@gmail.com

علاقائی مرکز: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ

کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد -500002

فون: 040-24415194

اس شمارے میں

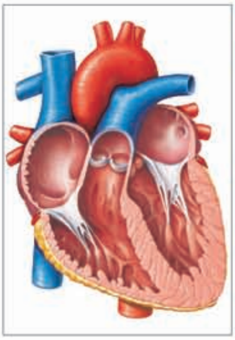

مدیر کا خط	آپس کی باتیں	مدیر	04
بڑوں کی باتیں	ڈاک خانہ	....	05
گاندھی جینتی	باپو اور بچے	پی ڈی ٹنڈن	08
نظمیں	لال بہادر شاستری	بیکل اتساہی	12
	آج ہے جمعہ، کل ہے سنیچر...	تنویر پھول	13
مضمون	دسہرا	مرتب: خالد اشرف	14
نظم	لوری	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	17
کہانی	دانیال اور چڑیا	ذکیہ مشہدی	18
مضمون	ہم اور ہمارا دل	ڈاکٹر محمد زاہد	20
نظمیں	جیسی کرنی ویسی بھرنی	نسیم عزیزی	22
	کتنی پیاری زبان ہے اردو	بے غم وارثی	24
	پرندہ اور انسان	کیفی سنبھلی	25
سائنس کی الف لیلہ	اولین غبارے	سکلٹف اور سکلٹف	26
نظم	علم	احمد امام	33
کہانی	پانی رے! پانی رے!	ڈاکٹر محمد ارشد خان	34
سیر کر دنیا کی	مانسر جھیل کی سیر	صلاح الدین احمد	38
قسط وار ناول	اُلٹا درخت	کرشن چندر	43
کہانی	مادری زبان	ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی	52
لطائف	ہنسی کے غبارے	ادارہ	55
ننھے فنکار	بچوں کی تخلیقات	....	56
	اردو فیس بک	....	61

آپس کی باتیں

پیارے دوستو! آپ میں سے بہتوں کو پتہ ہوگا کہ اکتوبر کا مہینہ ہمارے لیے کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ یہی وہ مہینہ ہے جس کی 2 تاریخ کو موہن داس کرم چند کا گجرات کے پور بندر علاقے میں جنم ہوا تھا جو بعد میں بابائے قوم مہاتما گاندھی کے نام سے مشہور ہوئے۔ انھوں نے ہندوستان کو آزاد کرانے میں جو اہم کردار ادا کیا ہے اس سے آپ سب یقیناً واقف ہوں گے۔ سابرمتی کے اس سنت نے ملک کے عوام کو اَہنسا اور بھائی چارے کا سبق دیا۔ گاندھی جی بچوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ بچے قوم کا مستقبل ہیں اور یہی بچے آگے چل کر ملک کی ترقی کا ذریعہ بنیں گے۔

پیارے بچو! آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ ہمارے ملک کے سابق وزیر اعظم لال بہادر شاستری کی پیدائش بھی اسی مہینے میں ہوئی تھی جنھوں نے 'جے جوان جے کسان' کا نعرہ دیا تھا۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل جو مردِ آہن کے نام سے مشہور ہیں وہ بھی اکتوبر ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے قومی یکجہتی اور اتحاد و اتفاق کا درس دیا تھا۔ وہ ملک کے پہلے وزیر داخلہ(Home Minister) تھے۔ اسی مہینے کی 17 تاریخ کو سرسید احمد خان بھی پیدا ہوئے تھے جنھوں نے تعلیمی تحریک کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا تھا۔ 24 مئی 1875 کو علی گڑھ میں 'مدرسۃ العلوم' کی بنیاد ڈالی جو آگے چل کر 1920 میں یونیورسٹی کی شکل اختیار کر گئی۔ آج وہی مدرسہ 'مسلم یونیورسٹی علی گڑھ' کے نام سے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ سرسید احمد خان نے تعلیم کے لیے بہت جدوجہد کی اور ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے کبھی محنت و مشقت سے جی نہیں چرایا، رات دن کام میں لگے رہتے تھے۔ انھوں نے کبھی مخالف قوتوں کی پرواہ نہیں کی۔ پیارے بچو! ان کے بارے میں مشہور ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ کسی ملازم کو تھپڑ مار دیا تھا اس بات سے ناراض ہو کر ان کی والدہ نے فوراً ان کو گھر سے باہر کر دیا اور تین دن کے بعد اس شرط پر واپسی کی اجازت دی کہ ملازم سے معافی مانگ لیں۔ سرسید نے معافی مانگنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ سرسید بچوں سے بہت محبت کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ بچے تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوں۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ "جب ایک قوم تعلیم حاصل کرنے سے دوری اختیار کرتی ہے تو غربت پیدا ہوتی ہے اور جب غربت آتی ہے تو ہزاروں جرائم اپنے ساتھ لاتی ہے۔"

پیارے بچو! یہ تمام شخصیات ہمارے لیے مشعلِ راہ اور قابل تقلید ہیں۔ ان کی زندگی کا ہم مطالعہ کریں گے تو ہمیں اپنی زندگی سنوارنے میں بہت مدد ملے گی۔

دوستو! ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کو آپ کی پسند کے مطابق سجاتے رہتے ہیں۔ اس مہینے بھی آپ کی پسند کو دھیان میں رکھتے ہوئے یہ شمارہ ترتیب دیا گیا ہے۔ آپ کے لیے عمدہ مضامین، پیاری پیاری نظمیں اور نصیحت آموز کہانیاں جمع کی ہیں۔

'بچوں کی دنیا' آپ کو کیسا لگتا ہے اور اس میں آپ مزید کیا تبدیلی چاہتے ہیں ہمیں ضرور لکھیں۔ آپ کے خطوط کا ہمیشہ کی طرح انتظار رہے گا!

آپ کا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈاک خانہ

محترم پروفیسر سید علی کریم (ارتضٰی کریم) نے بڑے خوبصورت انداز میں بچوں کو آزادی کی نعمت اور اس کی قدر و قیمت کا احساس دلایا ہے اور حیدر بیابانی کی نظم 'بعنوان 'ہندوستان والے' پڑھ کر علامہ اقبال کی نظم یاد آ گئی۔ طنز و مزاح کے اعتبار سے 'پھلوں کا مشاعرہ' کافی رسدار لگا۔ کہانیوں کے حصّے میں سبھی کہانیاں اچھی ہیں ۔ کہانی بعنوان 'دیر نہ ہو جائے' میں جناب محمد فروغ جعفری نے کچھوے اور خرگوش کی قدیم کہانی کو جس جدید طرز پر پیش کیا ہے اس سے ان کی سوچ و فکر کا بھرپور اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور قدیم روایات و کہانیوں کو عصری ادب میں ڈھالنے میں انھیں جو قدرت حاصل ہے اس کا بھی پتہ چلتا ہے۔ کہانی بے حد عمدہ پُر معنی اور بچوں کے لیے واقعہ کے عین مطابق ہے۔ 'جانے انجانے کیڑے' پڑھ کر اس مخلوق سے تعارف ہوا ۔ 'بچوں کی دنیا' کو اتنی محنت اور خوبصورتی سے سجانے اور پیش کرنے پر مبارک باد قبول کریں۔

نصر ملک، کوپن ہیگن، ڈنمارک

ماہانہ ''بچوں کی دنیا'' کے شمارے دیکھتا رہتا ہوں۔ یہ جان کر کہ بچوں کی دنیا کی اشاعت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے مسرّت ہوئی۔

حضور سہسوانی، سہسوان، اتر پردیش

یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' نئے سنگ میل قائم کر چکا ہے۔ ہم جیسے لوگ جنھوں نے اپنے بچپن میں 'کھلونا' سے اردو لکھنا پڑھنا سیکھا تھا، مایوس ہو گئے تھے کہ بھلا اب ایسا رسالہ کہاں نکلے گا جو بچوں کے ذہنوں کی 'کھلونا' کے طرز پر آبیاری کر سکے۔ مگر سچ بات یہ ہے کہ آپ نے یہ کارنامہ کر دکھایا۔ آج یہ دیکھ کر بڑا اطمینان اور سکون مل رہا ہے کہ آپ نے نئی نسل کو 'کھلونا' سے بھی اچھا دلچسپ معلوماتی اور دیدہ زیب ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کی صورت میں فراہم کرایا ہے۔ یقیناً یہ آپ کے جذبہ کامل، لگن اور کاوش کا نتیجہ ہے۔

رضا جعفری، لکھنؤ، اتر پردیش

رسالہ کے معیار میں ہونے والا اضافہ بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کے لیے بھی دلچسپی کا سبب بنتا جارہا ہے۔ 'کھلونا' کے بعد یہ بچوں کا واحد رسالہ ہے جو اس معیار کے ساتھ شائع ہورہا ہے۔ 'کھلونا' میں ایک جملہ ہوتا تھا'' آٹھ سے اسّی سال کی عمر کے لیے'' یہ جملہ بچوں کی دنیا پر صادق آرہا ہے۔ اللہ رسالے کی عمر اور آپ کے قلم کا زور قائم رکھے۔ آمین۔

ایڈوکیٹ حبیب ریتھ پوری، امراوتی، مہاراشٹر

آپ کی ادارت میں چھپنے والے قومی کونسل کے تمام رسائل و میگزین ایک سے بڑھ کر ایک ہیں جس کے لیے آپ اور آپ کی پوری ٹیم مبارکباد کی حق دار ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کی تربیت اور کردار سازی کی طرف خصوصی توجہ دی ہے۔ 'بچوں کی دنیا' واقعی قابل تعریف ہے۔

ناہید ندیم، مالیر کوٹلہ، پنجاب

عام رسالوں کے مقابلے 'بچوں کی دنیا' میں سائنسی مضامین، مزاحیہ مضامین کو جگہ دی جاتی ہے جو قابلِ تعریف ہے۔ بچوں کے ادیبوں کی وہ تحریریں جو بار بار بچوں کی نظروں سے گزرنی چاہئیں شامل ہوتی ہیں۔ اس کے لیے آپ کی اور آپ کی ٹیم کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

وسرتاج، چندرپور، مہاراشٹر

رسالہ 'بچوں کی دنیا' کا معیار اور اس کی مقبولیت دیکھ کر خوشگوار طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ لگتا ہے کہ ابھی اردو زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔

مناظر حسین، چاکند، گیا، بہار

ماہنامہ بچوں کی دنیا کا ہر شمارہ سابقہ شماروں سے بڑھ کر بے حد حسین اور خوبصورت ہوا کرتا ہے۔ مضامین، کہانیاں، نظمیں معیاری اور پسندیدہ ہوتی ہیں۔ سرِ ورق کی دلکشی اور تصویریں ماہنامہ کی ایک خاص پہچان ہے۔

محمود اختر جلالپوری، قاضی پورہ، جلال پور، اتر پردیش

'بچوں کی دنیا' دن بدن اپنی ظاہری و باطنی خوبیوں سے بہتر ہوتا جارہا ہے۔ 'سائنس کی الف لیلہ' کامکس اسٹوری بچوں کو خوب بھاتی ہے۔ نظموں کو آپ جس طرح سے مزیّن کرتے ہیں اس سے بچوں کا دل ان کی طرف کھنچتا جاتا ہے۔ یہاں میں صرف اتنا ہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نئے لکھنے والوں کو موقع عنایت فرمائیں۔ پرانے ادباء میں جو بہت نامور ادیب ہیں، ان کی تخلیقات کے معیار سے تو کوئی انکار ہی نہیں کرسکتا مگر نئے لکھنے والوں میں کچھ ٹیلینٹ ہے جسے جلا بخشنے کے لیے ان کی تخلیقات کا شائع ہونا کارآمد ہوسکتا ہے۔

سید اسد علی، بارسی ٹاکلی، اکولہ، مہاراشٹر

بچوں کا یہ رسالہ یقیناً بڑوں کے لیے بھی معلوماتی اور تفریح کا سامان ہے۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ آپ کا یہ رسالہ قومی یکجہتی کی بہترین مثال ہے۔ اس کے تمام مشمولات

انسانیت، امن، اتحاد و اتفاق کا درس دیتے ہیں۔
ہمارے بچپن کے دنوں میں بھی کئی ایسے رسالے شائع ہوتے تھے جن میں 'کھلونا' (دہلی) اور 'غنچہ' (بجنور میرے یہاں آتے تھے) 'غنچہ' میں تو میری کئی کہانیاں بھی چھپی تھیں۔ اس وقت میں پرویز عالم کے نام سے لکھتا تھا۔ ہماری کوشش ہے کہ ہم اپنے گھروں میں بچوں کو اردو پڑھنا لکھنا سکھائیں، سبھی کا ماننا ہے کہ یہ زبان نہیں ایک مکمل تہذیب ہے۔

پرویز اشرفی، جامعہ نگر، نئی دہلی

'فکر و تحقیق'، 'اردو دنیا' اور 'بچوں کی دنیا' تینوں پرچوں سے متعلق کیا کہوں۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں البتہ یہ ضرور کہوں گا میرے پاس الفاظ ہیں لیکن آپ کے ادارے کی ان پرچوں سے متعلق جو خدمات ہیں ان خدمات پر اظہارِ خیال کرنا چاہوں تو الفاظ قلم پر آنے سے شرماتے ہیں۔ کیوں؟ میں نہیں جانتا۔
جون، جولائی بچوں کی دنیا کا مطالعہ کیا۔ زیرِ نظر جون کا شمارہ ہے۔ میری نظر جن مناظر پر تا دیر ٹھہرنے کی نعزش کی ہے وہ یہ ہیں۔ حنیف کیفی کی نظم 'نازک کندھے بھاری بوجھ' موجودہ تعلیمی نظام پر سچا طنز ہے۔ انیس الحسن صدیقی کے مضمون میں 'بلٹ ٹرین' سے متعلق جتنی معلومات تھیں ان میں بہت کچھ اضافہ ہو چکا ہے۔ محمد زاہد کا مضمون 'تھائی لینڈ' یقیناً قدرتی حسن سے مزین ہے۔ آپ نے میراجی (محمد ثناء اللہ ڈار) کی نظم جنگ کا انجام اور تصویر شائع کر کے واقعی قارئین پر احسان کیا ہے۔ کرشن چندر کا 'الٹا درخت' پڑھا ہوا ہے۔ پھر نیا مزہ آ رہا ہے۔

اشفاق کارنجوی، اکولہ، مہاراشٹر

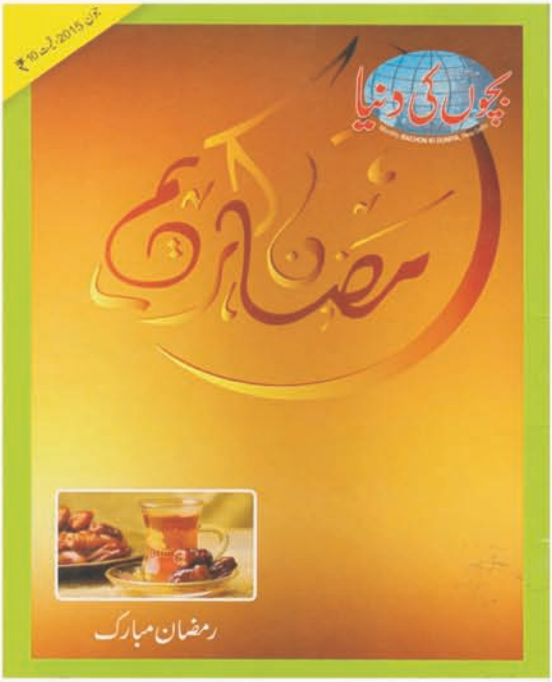

'بچوں کی دنیا' شمارہ جون 2015 زیرِ مطالعہ ہے۔ تمام مشمولات نونہالوں کی دلچسپی کے متقاضی ہیں۔ ان کی تخلیقات ان کے چلبلے پن اور شوخی کو نمایاں کرتی ہیں، بچوں کی سائنسی معلومات میں 'اب آ رہی ہے بلیٹ ٹرین'، بلیک باکس، دنیا کا کامیاب سرجن اور انگریزی نمک اہمیت کی حامل ہیں۔ واقعی اس ایک رسالے نے اپنی انفرادی خصوصیت سے غیر اردو داں افراد کو گرویدہ بنا کے اردو زبان سے رغبت پیدا کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس بات کا بیّن ثبوت ڈاکٹر پی این مینن جو کہ ریٹائرڈ پروفیسر آف ایجوکیشن ہیں۔ جنھوں نے اکیڈمی کے اردو سرٹی فیکٹ کورس میں اردو سیکھنے کے لیے داخلہ لیا ہے۔ NCPUL کے تمام اراکین کی جملہ مساعی کے لیے مبارک باد۔

بسم اللہ عدیم، برہان پور

■ پی ڈی ٹنڈن

باپو اور بچے

بچو، آؤ تمہیں اس انسان کی کہانی سنائیں جو تم سے بہت پیار کرتا تھا اور جس نے انگلستان کے بادشاہ جارج پنجم سے کہا تھا:

''بچے تو میری جان ہیں۔''

وہ ایک انوکھا انسان تھا۔ قد کا چھوٹا تھا۔ جو تعلیم پانے کے لیے دیس سے باہر بھی گیا تھا اور جس کی شادی بہت چھوٹی عمر میں کردی گئی تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں اس نے کوئی ایسا بڑا یا نرالا کام نہ کیا جس سے اس کی شہرت ہوتی لیکن آگے چل کر اس نے ایسا کام کر کے دکھایا جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ اس نے فوج اور ہتھیاروں کا سہارا لیے بغیر ہندوستان کو آزاد کرالیا۔ وہ تھے مہاتما گاندھی۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آج تم کسی غلام ملک کے شہری نہیں ہو بلکہ ایک آزاد ملک کے

رہنے والے ہو۔ لیکن وہ خود کو تم سے بھی زیادہ خوش نصیب سمجھتے ہیں جو کبھی انگریزوں کے غلام تھے اور جنھوں نے آزادی کے لیے قربانیاں دیں اور آخر ملک کو آزاد کرالیا۔

بچو! اب میں تمھیں موہن داس کرم چند گاندھی کے بارے میں کچھ ایسی باتیں بتاؤں گا جو بہت دل چسپ ہیں۔ ہاں۔ زیادہ تر تو میں تمھیں ایسی باتیں بتاؤں گا جو تمھیں مزے دار بھی لگیں گی اور ان سے تمہاری ہمت بڑھے گی۔ تمہارے دل میں کچھ کر دکھانے کی لگن پیدا ہوگی۔ اچھا، سنو۔

بچوں سے محبت

گاندھی جی کو ان کے دیس کے رہنے والے احترام اور پیار سے باپو کہتے تھے وہ چاہے کیسے ہی کام میں کیوں نہ لگے ہوں بچوں کو کبھی بھولتے نہیں تھے۔ وہ بچوں کے ہر خط کا جواب دیتے تھے۔ ایک لڑکا تھا جس کا نام مہادیو ہنگورانی تھا۔ اسے رات کو بہت ڈر لگتا تھا۔ نہ جانے ایسا کیوں تھا؟ لیکن وہ بیچارہ اچھی طرح سو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے باپ آنند ہنگورانی جی جان سے گاندھی جی کی قدر کرتے تھے اور انھیں کے ساتھ رہتے بھی تھے۔ ایک دن انھوں نے اس تکلیف کا باپو سے ذکر کیا۔ باپو نے فوراً مہادیو کو یہ خط لکھ دیا۔

بیٹے! تیری عمر بڑی ہو۔

آنند سے پتہ چلا کہ تو رات کو بہت ڈرتا ہے۔ ارے یہ رات کو ڈر کیسا؟ بھگوان رات کو سوتا نہیں۔ ہم لوگ تو سوتے ہیں اور بھگوان ہماری دیکھ بھال کرتا ہے۔ پھر ہم کیوں ڈریں؟ تو رام کا نام لے کر سویا کر اور ڈر کو دل سے نکال دے۔

باپو کی دعائیں

مہادیو کے ماں باپ یہ خط پا کر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے یہ خط مہادیو کو پڑھ کر سنایا اور کہا کہ باپو نے لکھا ہے کہ تم بالکل نہ ڈرا کرو۔ اس کے بعد بچے کی وہ تکلیف دھیرے دھیرے بالکل ختم ہوگئی۔ باپو نے مہادیو کو اور بھی کئی خط لکھے تھے جنھیں میں آگے چل کر تم لوگوں کو سناؤں گا، بلکہ ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خط تم خود اس کتاب میں دیکھ لوگے۔ ان کی لکھائی بہت خراب تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ بڑے آدمیوں کی تحریر خراب ہی ہوتی ہے۔ لیکن کسی امتحان میں کامیاب ہونے کے لیے تو یہ بات بہت ضروری ہے کہ تحریر اچھی ہو۔ تو بچوں! تم اپنی تحریر کا خیال رکھنا اور کوشش کرنا کہ تمہاری لکھائی بہت اچھی ہو۔

ڈاک ٹکٹ کی فرمائش

1945 میں کنیڈا سے ایک گیارہ برس کے بچے نے باپو کو ایک خط میں لکھا:

''اگر آپ مجھے ہندوستانی ڈاک ٹکٹ بھیج دیں تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ اس کے بدلے میں آپ کو کنیڈا اور امریکہ کے ڈاک ٹکٹ بھیجوں گا۔''

اس بچے کو کیا معلوم تھا کہ گاندھی جی کو نہ ٹکٹوں کی ضرورت اور نہ ان کے جمع کرنے کا شوق۔ ان کے پاس تو ہر جگہ سے خط آتے تھے۔ لیکن باپو نے اس بچے کو مایوس نہیں کیا، اسے ڈاک ٹکٹ بھیج دئے۔

باپو کے لیے کھلونے اور مٹھائی

باپو کو بچوں سے بہت پیار تھا۔ جب بچے ان سے ملتے تھے تو وہ انہیں بہت پیار کرتے تھے۔ ایک بار جب وہ لندن میں تھے تو وہاں کے بچے ان سے ملنے آئے۔ وہ باپو کو ''چچا گاندھی'' کہتے تھے۔ یہ لوگ باپو سے بہت خوش رہتے تھے۔ ایک دن انھوں نے ٹوکری بھر کھلونے اور مٹھائی باپو کو بھیج دئے۔ باپو بہت خوش ہوئے۔ لیکن ان کا شکریہ ادا نہ کر سکے کیوں کہ ان کو جلدی ہندوستان لوٹنا تھا۔ اور جب وہ ہندوستان پہنچے تو گرفتار کر لیے گئے۔ مگر وہ بچے ان کو جیل میں بھی یاد آتے رہے۔ وقت ملتے ہی باپو نے ان بچوں کو یہ خط لکھا:

میرے ننھے دوستو!

تمہاری یاد مجھے اکثر آتی ہے۔ اس دوپہر کو جب ہم لوگ اکٹھے بیٹھے تھے تو میرے سوالوں کے جواب تم نے بڑی سمجھ داری سے دیے تھے اور جب میں کنگسلے ہال میں تھا تو میں تمہارے محبت بھرے تحفے کے لیے شکریہ ادا نہ کرسکا۔ اب یہ خط تم

لوگوں کو جیل خانے سے لکھ رہا ہوں مجھے امید تھی کہ ہندوستان پہنچ کر تمہاری دی ہوئی چیزیں اپنے آشرم کے بچوں میں بانٹ دوں گا۔ لیکن میں آشرم تک پہنچ ہی نہ پایا۔ کیا ہنسی کی بات نہیں کہ جیل خانے میں رہ کر بھی میں اپنے آپ کو قیدی نہیں سمجھتا۔ میں یہی سمجھتا ہوں کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔
محبت کے ساتھ وہی جسے تم چچا گاندھی کہتے ہو۔

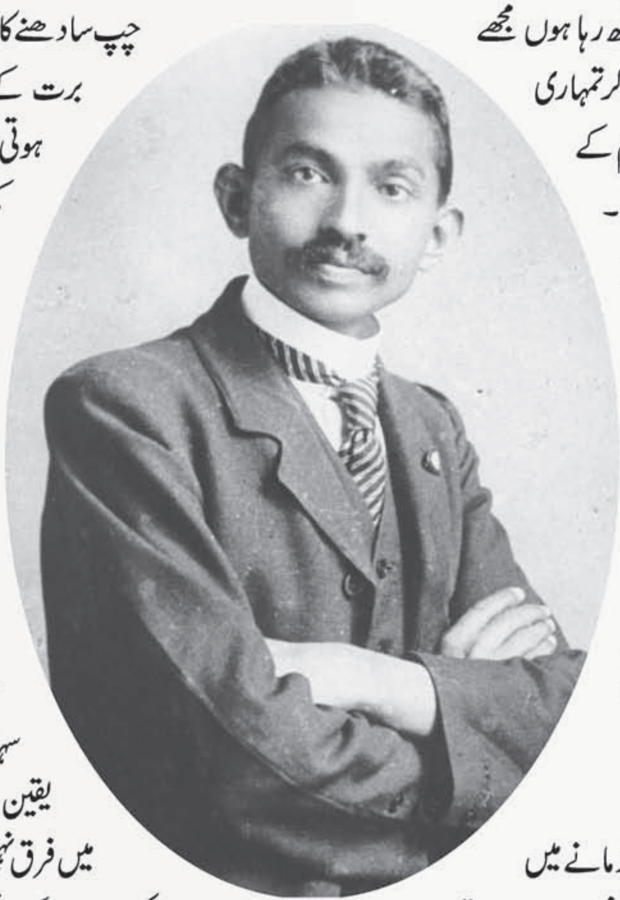

فیشن ایبل گاندھی

بچو! کیا تم جانتے ہو کہ جس زمانے میں گاندھی جی لندن اور دکنی افریقہ میں تھے تو بڑے فیشن ایبل تھے، وہ ٹوپ پہنتے تھے اور ٹائی لگاتے تھے۔ جب وہ ہندوستان واپس آئے تو انھوں نے دیکھا کہ یہاں کی جنتا غریب اور دکھی ہے، انھوں نے سوچا کہ انھیں اپنے لباس پر زیادہ خرچ کرنے کا حق نہیں، اس کے بعد انھوں نے دھوتی اور چپل پہننا شروع کر دیا۔ ان کا کھانا بھی بہت سادہ ہوتا تھا۔ وہ بکری کا دودھ پینے اور کچھ پھل کھانے لگے تھے۔ اب انھوں نے اپنی زندگی کے لیے سخت قاعدے بنالیے تھے۔ وہ صبح سویرے اٹھ کر بھجن کرتے اس کے بعد ایک چھوٹی سی سبھا ہوتی۔ اس میں آشرم والے شریک ہوتے اور بھجن گاتے۔ وہ صبح وشام گھومنے جایا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی مون برت یعنی چپ سادھنے کا برت بھی رکھتے تھے۔ اگر مون برت کے دن کوئی ضروری بات کہنی ہوتی تو کاغذ پر لکھ دیتے تھے۔ کھانے کا وقت مقرر تھا۔ اسی طرح سونے کا وقت بھی طے تھا۔ وقت کے مطابق ہی لوگوں سے ملتے تھے۔ مطلب یہ کہ سارا کام مقرر کیے ہوئے وقت کے مطابق ہی کرتے تھے۔

بھگوان کا سہارا

وہ ہر کام میں بھگوان اور جنتا کا سہارا لیتے تھے وہ بھگوان پر پکا یقین رکھتے تھے۔ وہ امیر اور غریب میں فرق نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ کوڑھیوں کے زخم وہ خود دھوتے اور صاف کرتے تھے۔ انھوں نے غریبوں کی مدد اور ہری جنوں کی خدمت میں اپنی زندگی صرف کر دی۔ ان کی پیدائش گجرات میں ہوئی اور چھوٹی سی عمر میں کستور با سے ان کی شادی ہوگئی۔ اس وقت ان دونوں کی عمر برابر ہی تھی۔ اور وہ دونوں اپنے بچوں اور دوسروں کے بچوں میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ وہ چھوٹے آدمی کی بات بھی اتنی ہی توجہ سے سنتے تھے جتنی توجہ سے بڑے آدمی کی۔ کسی کو نقصان پہنچانا ان کی عادت نہیں تھی۔ مختصر یہ کہ انہیں دنیا کے سارے انسانوں سے محبت تھی۔

(قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب 'باپو اور بچے' سے ماخوذ)

نظم

بیکل اتساہی

لال بہادر شاستری

وہ لال دیش کے احساس کا وقار رہا
ہر ایک دل کے چمن کے لیے وقار رہا
تھا قد میں چھوٹا، ارادوں کا اک پہاڑ تھا وہ
وہ اہتمام سیاست کا اختیار رہا
تھا اس کی سادہ مزاجی میں بانکپن کا شعور
اسی پہ حسن ترقی کا انحصار رہا
وہ جوڑتا ہی رہا ایکتا کی کڑیوں کو
وطن کے روپ کا انمول وہ سنگار رہا
وہ ایک عزم تھا سیماؤں کے جوانوں کا
تمام عمر کسانوں کا اعتبار رہا
بہادر ایسا جو کاندھے پہ دشمنوں کے بھی
وہ بعد موت بڑی شان سے سوار رہا
کہاں ہے لال بہادر یہ ماں نے پوچھا ہے
وہ شہرِ امن گیا جس کا انتظار رہا
اسی کے نام پہ بیکلؔ ہیں زندگی کے لیے
کہ جس کا نام ہر اک زندگی کا پیار رہا

Bekal Utsahi
Sughra Rose
Civil Line Balrampur - 271201

تنویر پھول

آج ہے جمعہ...

آج ہے جمعہ، کل ہے سنیچر، پرسوں ہے اتوار
آج نمازِ جمعہ پڑھ لیں، رب کو یاد کریں
ہفتے کو ہم کر لیں شاپنگ، آدھا دن گھومیں
امی سے حلوہ بنوائیں اعلیٰ، ذائقے دار
پڑھیں رسالے اور کتابیں، کام بھی کچھ کر لیں
کریں ترقی دنیا میں ہم، چمکے دیس کا نام
کام کرو اے پیارے بچو! بات یہ رکھنا یاد

چھٹی کا تہوار منائیں مل کر ہم سب یار
کریں تلاوت، مطلب سمجھیں، دل کو شاد کریں
شام کو سیر سپاٹا کر کے واپس گھر لوٹیں
آؤ بچوں ! مل کر منائیں چھٹی کا تہوار
علم و ہنر کا ایک خزانہ دل میں ہم بھر لیں
خوشی خوشی سب کام کریں، ہو محنت صبح و شام
پھولؔ کا نغمہ مل کر گاؤ، دیس رہے آباد

Tanweer Phool
NewYork, America

مضمون

■ خالد اشرف

دسہرا

ہر سال ستمبر اکتوبر کے مہینے میں دس دن تک دسہرا منایا جاتا ہے۔ یہ شمالی ہندوستان کا کافی اہم تہوار ہے۔ ابتدائی نو دن نوراترے ہوتے ہیں ان دنوں رام لیلا ہوتی ہے اور دسویں دن دسہرا ہوتا ہے۔

دسہرا دراصل رام چندر جی کی ظالم راجا راون پر فتح کی خوشی میں منایا جاتا ہے۔ دس دن تک رامائن کے مختلف پہلوؤں کو ڈرامائی شکل میں جگہ جگہ دکھایا جاتا ہے۔ گاؤں، قصبوں اور شہروں میں ہر جگہ رامائن دکھانے کے لیے پہلے سے پنڈال لگا دیے جاتے ہیں، جس میں مقامی اداکار رام، لکشمن، سیتا، راون، ہنومان وغیرہ کے کردار ادا کرتے ہیں۔ رام لیلا اکثر رات میں دکھائی جاتی ہے اور اس موقع پر خصوصی روشنی کا انتظام کیا جاتا ہے۔ رام چندر جی سے عقیدت

رکھنے والے پابندی سے رام لیلا دیکھتے ہیں اور دسہرے یا وجیا دشمی کے دن راون کے بہت بڑے بڑے پتلوں کو جلایا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ لنکا کا راجا راون ایک دن دھوکا دے کر رام چندر جی کی بیوی سیتا کو اٹھا کر لے گیا۔ اپنی اور سیتا کی عزت کی حفاظت کے لیے رام اور لکشمن نے تلوار اٹھائی، لنکا پر حملہ کیا اور اس کو جلا کر راون کا خاتمہ کیا۔ اجودھیا کے راجا رام چندر جی جب سیتا اور لکشمن کے ساتھ اپنی راجدھانی واپس پہونچے تو رات کو فتح کی خوشی میں سارے شہر میں چراغاں کیا گیا، جس کی یاد میں آج دیوالی منائی جاتی ہے۔ ہنومان اور راون کی بانرفوج نے رام جی کی بہت مدد کی تھی کیونکہ وہ بڑے رام بھگت تھے۔

یوں تو رام لیلا ہندوستان کے سبھی علاقوں میں منائی جاتی ہے۔ لیکن بنارس کی رام نگر رام لیلا، ان میں سب سے بڑی اور لمبی ہوتی ہے۔ یہ ایک مہینہ تک جاری رہتی ہے۔ یہ رام لیلا بنارس کے راجا نے شروع کرائی تھی۔ اس رام لیلا میں اجودھیا، اشوک واٹیکا، سری لنکا اور بن کے الگ الگ مناظر بہت بڑے میدان میں پیش کیے جاتے ہیں۔ یہاں جو رام لیلا دکھائی جاتی ہے وہ تلسی داس کی اودھی زبان میں تخلیق کی گئی رام لیلا کی ڈرامائی شکل ہوتی ہے۔ تلسی داس نے یہ کہانی چوپائیوں کی شکل میں اکبر بادشاہ کے زمانے میں لکھی تھی، عام لوگ اسی کو پڑھتے اور گاتے ہیں اور سمجھتے بھی ہیں۔

بڑی بڑی رام لیلاؤں میں آج کل عورتوں کو بھی اداکارہ کے طور پر شامل کیا جاتا ہے۔ لیکن گاؤں اور قصبوں میں ابھی بھی عورتوں کے کردار خوبصورت لڑکوں کے ذریعے ادا کیے جاتے ہیں۔ رام لیلا کے کردار چمک دار رنگ برنگے لباس پہنے رہتے ہیں۔ جو پرانے زمانے کے ہندو کلچر کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ راجا، موتیوں لگے تاج پہنتے ہیں، رانیاں زیوروں اور آرائش کے بہترین سامان سے آراستہ ہوتی ہیں نمائش میں برے کام کرنے والوں کی شکست پر شردھا کے

ساتھ تالیاں بجاتے ہیں اور نیک کرداروں کی ہمدردی میں رنجیدہ ہوتے ہیں۔ ہنومان عقیدت کے ساتھ اپنی بہادری کے جوہر دکھاتے ہیں۔

دسہرے کے دن راون، اس کے بھائی کمبھ کرن اور اس کے بیٹے میگھ ناد کے سیکڑوں فٹ اونچے پتلے جلائے جاتے ہیں، جن میں پٹاخے بھرے ہوتے ہیں۔ اسی طرح برائی کی شکست ہونے کے بعد شام کو بھرت ملاپ کا منظر دکھایا جاتا ہے، جب رام چندر جی فتح یاب ہوکر اجودھیا میں اپنے بھائی بھرت سے گلے ملتے ہیں۔

تامل ناڈو میں 'نوراتری' میں لکشمی پاروتی اور سرسوتی کی عبادت کی جاتی ہے۔ دسویں دن لوگ اپنے اپنے کاموں پر واپس جاتے ہیں اور بچوں کی اس دن سے تعلیم شروع کی جاتی ہے۔ اسی طرح کرناٹک میں دسہرے والے دن میسور کے چمنڈ یشوری مندر میں لاکھوں لوگ پوجا کرتے ہیں۔ کیرالہ میں یہ تیوہار کم دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ یہاں لوگ وجے لکشمی کے دن صرف پوجا کرتے ہیں۔

دسہرا بدی پر نیکی کی فتح کا جشن ہے۔ یہ کُلو، ہماچل پردیش، مغربی بنگال، اترپردیش اور بہار وغیرہ میں اتنے شاندار طریقے سے منایا جاتا ہے کہ اسے لوگ دور دور سے دیکھنے آتے ہیں۔

(بحوالہ: 'ہمارے تہوار' مرتبہ خالد اشرف)
نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

لوری

اے میرے شہزادے سوجا
میرے پیارے بیٹے سوجا
سوجا راج دلارے سوجا
سوجا میرے دل کے ٹکڑے
سوجا میری آنکھ کے تارے
سوجا میرے چاند گگن کے
سوجا نور نظر اب میرے
اے میرے شہزادے سوجا
میرے پیارے بیٹے سوجا
سوجا راج دلارے سوجا
خوابوں کی تعبیر ہے تو ہی
ارماں کی تنویر ہے تو ہی
ممی کی تقدیر ہے تو ہی
پاپا کی تصویر ہے تو ہی
اے میرے شہزادے سوجا
میرے پیارے بیٹے سوجا
سوجا راج دلارے سوجا
تجھ سے میرا گھر ہے روشن
تو ہی مکھڑا تو ہی درپن
تو ہی گلستاں تو ہی گلشن
تو ہی خزانہ تو ہی مخزن
اے میرے شہزادے سوجا
میرے پیارے بیٹے سوجا
سوجا راج دلارے سوجا
جھولے لے کر ہے جو آتی
تجھ پر اے جو وارے جاتی
کون ہے راجا کون ہے رانی
تو جو راجا، نیندیا رانی
اے میرے شہزادے سوجا
میرے پیارے بیٹے سوجا
سوجا راج دلارے سوجا

Dr. Manazir Ashiq Harganvi
Kohsaar, Bhikanpur-3
Bhagalpur - 812001 (Bihar)

ذکیہ مشہدی

دانیال اور چڑیا

چھ سال کے دانیال کو چڑیاں بہت اچھی لگتی تھیں۔ اڑتی، پھدکتی، چہچہاتی چڑیاں دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتے۔ ہرے ہرے طوطے انھیں خاص طور پر اچھے لگتے تھے۔ ایک بار دانیال نے اپنی ممی سے کہا کہ وہ طوطا پالنا چاہتے ہیں۔ لیکن ممی نے بتایا کہ طوطے قید میں رہنا پسند نہیں کرتے۔ انھیں اپنی آزادی بہت پیاری ہوتی ہے۔ گھر کے سامنے کے درختوں پر بہت سی چڑیاں گھر بناتی ہیں۔ خوب چوں چوں کرتی ہیں۔ انھیں دیکھا کرو۔ دانیال ممی کی بات مانتے تھے۔ انھوں نے طوطا خرید نے کی ضد چھوڑ دی۔ بس چھٹی ملنے پر بالکونی پر کھڑے ہو جاتے اور طرح طرح کی چڑیوں کو دیکھتے۔ وہ سب برگد کے گھنے پیڑ پر بسیرا کرتی تھیں۔ پیڑ نے سب کو پناہ دے رکھی تھی۔

ایک دن دانیال شام کو کمرے میں آئے تو دیکھا ایک چڑیا ان کے کمرے میں آگئی ہے۔ چھوٹی سی چڑیا تھی۔ کالے رنگ کی لیکن بڑی پیاری، بڑی بھولی۔ اس کا جسم سڈول تھا اور پتلی سی دم تھی۔ دم لگاتار اوپر نیچے ہل رہی تھی۔ اس چڑیا کو انھوں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

دانیال چڑیا کو کمرے میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ بھاگ کر ممی کو بلا کر لائے۔ انھوں نے بتایا یہ شاما ہے۔ بڑا میٹھا بولتی ہے اور خوب سیٹیاں بجاتی ہے۔ یہاں شاید بھٹک کر آ گئی ہے۔ چلو اسے واپس بھیج دیں۔ انھوں نے چڑیا کو ہشکایا۔

''یہ ممی چڑیا ہے یا بچہ چڑیا؟'' دانیال نے پوچھا

''یہ ممی چڑیا ہے۔''

''تب تو اسے ضرور بھیج دیجیے۔ اس کے بچے انتظار کر رہے ہوں گے۔'' دانیال نے کہا اور ممی کے ساتھ وہ بھی چڑیا کو ہشکانے لگے۔

چڑیا کچھ گھبرا گئی تھی۔ شام گہری ہونے سے اسے دکھائی بھی کم دے رہا تھا۔ وہ کبھی کمرے میں لگی ٹیوب لائٹ پر بیٹھتی۔ کبھی پھدک کر دیوار گھڑی پر چلی جاتی۔ کبھی پنکھے کے پروں پر اور کبھی بڑی سی پینٹنگ کے فریم پر۔ دانیال اور ان کی ممی نے لاکھ کوشش کی لیکن وہ دروازے کی طرف گئی ہی نہیں۔

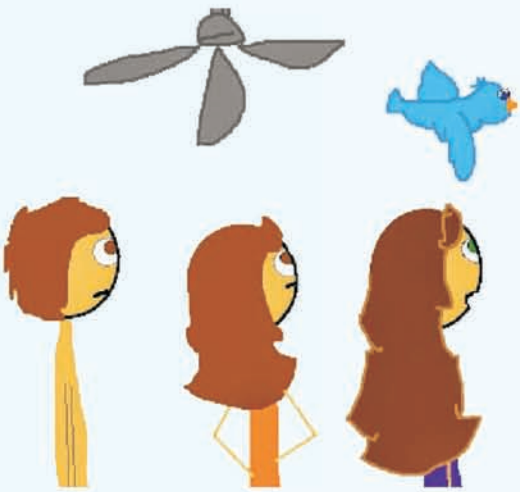

دروازہ بالکونی پر کھلتا تھا اور وہ ادھر ہی سے آئی تھی۔

''ایسا کرتے ہیں فی الحال اسے یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ صبح اسے راستہ مل جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ آج رات یہ ہماری مہمان رہے گی۔''

دانیال تو خوش ہو گئے۔

لیکن کھانا کھانے کے بعد سب لوگ کمرے میں آئے تو پاپا نے کہا۔ اگر پنکھا چلایا گیا اور چڑیا اڑی تو اس سے ٹکرا سکتی ہے۔ ٹکرائی تو اس کے بازو ٹوٹ جائیں گے۔ ہوسکتا ہے مر بھی جائے۔ دانیال بہت پریشان ہو گئے۔ پاپا تب پنکھا نہیں چلائیں۔

''گرمی بہت ہے۔'' ممی پاپا نے فکرمند ہو کر کہا۔

''ہم لوگ ایک رات ایسے ہی سو جائیں گے، بغیر پنکھے کے۔ کھڑکیاں کھول دیجیے۔ تھوڑی باہر کی ہوا آجائے گی۔'' دانیال نے تجویز پیش کی۔

ممی سمجھ رہی تھیں دانیال راضی نہیں ہوں گے۔ ان کی رحم دلی دیکھ کر وہ خوش ہو گئیں۔ اس رات کو پنکھا نہیں چلا۔ کچھ دیر لوگ الٹ پلٹ کرتے رہے پھر سو گئے۔ دانیال اسکول جانے کی وجہ سے سویرے اٹھتے تھے۔ اٹھتے ہی چڑیا کو دیکھا۔ وہ پنکھے کے پر پہ بیٹھی ہوئی تھی۔

''اچھا ہوا جو پنکھا نہیں چلایا گیا'' انھوں نے خوش ہو کر کہا۔

ممی نے چڑیا کو پھر ہشکایا۔ اس بار وہ تھوڑا سا ہی اِدھر اُدھر اڑی۔ جلد ہی اسے دروازہ نظر آگیا۔ وہاں سے اڑ کر وہ بالکونی سے نکلی اور سیدھی پیڑ پر جا بیٹھی۔ جاتے جاتے اس نے بڑی میٹھی سیٹی بجائی۔

''ممی۔ ممی۔ وہ کہہ رہی ہے تھینک یُو۔'' دانیال تالی بجا

کر بولے۔ ''اب اس کے بچے خوش ہو جائیں گے کہ ممی آگئی۔'' وہ جلدی جلدی اسکول جانے کے لیے تیار ہونے لگے۔ کلاس میں سب کو چڑیا کی کہانی سنانے کی جلدی جو تھی۔ شاما چڑیا کی۔

Zakia Mashhadi
F-1, Grand Pallavi Court
Judges Court Road
Patna - 800004 (Bihar)

مضمون

■ ڈاکٹر محمد زاہد

ہم اور ہمارا دل

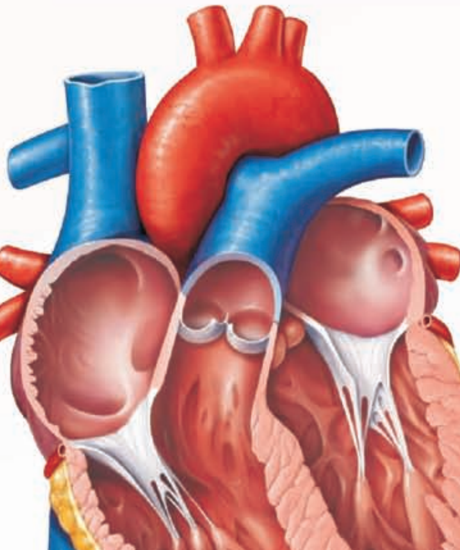

ہمارے جسم کا ایک بہت اہم عضو یا حصّہ دل ہے۔تم نے شاید اپنی کورس کی کتاب میں اس کے بارے میں پڑھا ہو۔ روزمرّہ کی زندگی میں لوگ بول چال میں بھی اس کا استعمال کرتے ہیں جیسے دل سخت ہونا، دل دھڑکنا، دل سے اتر جانا وغیرہ۔تم نے اپنے والدین کو کہتے سنا ہوگا کہ فلاں شخص دل کی بیماری کا شکار ہے یا اس کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ دل کا دورہ جسے 'ہارٹ اٹیک'(Heart Attack) بھی کہا جاتا ہے آجکل عام ہوگیا ہے۔اس بیماری سے بہت سے لوگ روزمرتے ہیں یالاچار ہوجاتے ہیں۔آؤ تمھیں دل کے بارے میں آج کچھ بتاتے ہیں۔

انسان کا دل دونوں پھیپھڑوں کے درمیان سینے کے اندر تھوڑا سا بائیں جانب ہوتا ہے۔اس کی شکل مخروطی اور رنگ گہرا سرخ ہوتا ہے۔ سائز میں یہ عموماً بند مٹھی کے برابر ہوتا ہے۔ یہ انسانی جسم کے لیے پمپ(Pump) کا کام کرتا ہے اور خالص صاف خون کو بدن کے ہر حصّے میں پہنچاتا ہے۔ ساتھ ہی گندے خون کو اکٹھا کر کے دوبارہ استعمال کے لائق بناتا ہے۔آدمی زندہ رہنے کے لیے ناک سے آکسیجن گیس اندر کھینچتا ہے۔ یہ گیس پھیپھڑے میں جا کر اس خون میں شامل ہوتی ہے جو دل کے ذریعہ یہاں پہنچتا ہے۔ اس طرح دل اور پھیپھڑے کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔

انسانی دل کے چار خانے ہوتے ہیں جس میں سے اوپر کے دو خانے آریکل(Auricle)اور نیچے کے دو خانے وینٹریکل(Ventricle) کہلاتے ہیں۔ دائیں وینٹریکل سے ایک نلی نکلتی ہے جو دو حصّوں میں بنٹ کر دونوں پھیپھڑوں میں بغیر آکسیجن والا خون پہونچاتی ہے جبکہ بائیں وینٹریکل سے نکلنے والی نلی پورے جسم کو تازہ آکسیجن ملا خون فراہم کرتی ہے۔ دل بار بار پھیلتا اور سکڑتا ہے۔اسے ہم دل کی دھڑکن کہتے ہیں۔ایک منٹ میں کسی بالغ انسان کا دِل آرام کرنے کی حالت میں تقریباً72بار دھڑکتا ہے۔

جس طرح ہر مشین کام کرتے کرتے خرابی کا شکار ہو جاتی

ہے یا پرانی ہونے پر اس کی طاقت گھٹتی ہے اسی طرح انسانی دل بھی بیماریوں کے گھیرے میں آتا ہے اور اس کی مرمّت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس طرف فوراً توجہ دینی چاہیے اور ماہر ڈاکٹر سے صلاح ومشورہ کرنا چاہیے۔

اگرچہ دل کا مرض بڑے لوگوں میں زیادہ ہوتا ہے لیکن چھوٹے بچّوں میں بھی پیدائشی طور پر دل کمزور ہوسکتا ہے۔ بچّے کے ہونٹ، زبان اور ناخن اگر نیلے لگتے ہوں یا رونے پر نیلے پڑ جاتے ہوں، سانسیں تیز چلتی ہوں، سینے میں گڑگڑاہٹ کی آواز نکلتی ہو تو اسے بچّوں کے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہیے۔

بالغ لوگوں میں سینے میں بائیں جانب درد اٹھنا، بلاوجہ تکان، سانس کا کھینچنا، کھانسی کے دوران بلغم کے ساتھ خون کے چھینٹے آنا، اچانک بے ہوش ہوجانا وغیرہ دل کے مرض کی علامتیں ہیں۔ ایسے لوگوں کو مسلسل دوا کھانا اور پرہیز کرنا ضروری ہے۔ مگر اس سے پہلے ان کو اسپتال لے جانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ اسپتال میں آکسیجن دینے سے آدمی کی جان بچ سکتی ہے۔

دل کی بیماری میں غذا اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ایسے مریضوں کو انڈے، گھی، مکھن، گائے اور خصّی کا گوشت، فاسٹ فوڈ (Fast Food)، بریانی اور ٹھنڈے شربت سے مکمل پرہیز کرنا چاہیے۔ شراب اور سگریٹ کو تو ہاتھ بھی نہیں لگانا چاہیے۔ ہری سبزی، پھل اور دالوں کا استعمال مفید ہے۔ پانی زیادہ مقدار میں پینا اچھا ہے۔ ائرکنڈیشنر مشینوں کا گھر گھر رواج ہے ان کی وجہ سے جسمانی محنت کم ہوگئی ہے۔ ورزش کرنا بند ہوگیا

ہے۔ میدانوں میں چہل قدمی کا رواج ختم ہورہا ہے۔ لوگ راتوں کو زیادہ جاگتے ہیں۔ ان چیزوں نے دل کے امراض کو پھیلانے میں خاصہ اہم رول نبھایا ہے۔

آپ کو چاہیے کہ خود کو اور اپنے گھر کے لوگوں کو دل کی بیماری سے بچانے کی کوشش کریں۔ اپنا کام خود کرنے کی عادت ڈالیں۔ رات کو جلدی سوئیں۔ صبح کو ورزش کرنا ضروری ہے۔ شام کو ٹہلنے کے لیے نکلیں۔ ٹی وی اور کمپیوٹر کے سامنے دو تین گھنٹے سے زیادہ نہ بیٹھیں۔ پھل اور سبزی کا استعمال کرتے رہیں۔

Dr. Mohd. Zahid
B-5, Prince Dilwar Jan lane
Garden Reach, Kolkata (W.B)

نظم

نسیم عزیزی

جیسی کرنی ویسی بھرنی

کسی جنگل میں ایک اونٹ اور گیدڑ ساتھ رہتے تھے
مصیبت جو بھی آتی تھی اسے باہم وہ سہتے تھے

ادھر تھا اونٹ بھولا تو ادھر مکار تھا گیدڑ
ستاتا تھا اسے اکثر بڑا ہشیار تھا گیدڑ

سنی گیدڑ نے اک دن یہ خبر ہے لاش کتے کی
پڑی اس پار ندی کے جہاں ہر سمت ہریالی

چلی کچھ چال ایسی اونٹ شیشے میں اتر آیا
سنی تجویز تو منہ میں بھی اس کے پانی بھر آیا

کہا گیدڑ نے بھائی اونٹ سارے کھیت چر جانا
مجھے تو لاش سے کتے کی ہے بس شوق فرمانا

ارادہ باندھ کر دونوں ندی کے پاس جا پہنچے
ندی گہری تھی، اس کے پاٹ تھے کچھ اور بھی چوڑے

اسے اب پار کرنے کا جو مشکل مرحلہ آیا
نکالا حل بنام دوستی گیدڑ نے کچھ ایسا

چڑھا وہ اونٹ کے اوپر ندی کے پار جا پہنچا
ذرا سی دیر کو ٹھہرے چلے آگے تو یہ دیکھا

پڑی تھی لاش کتے کی، بھلا گیدڑ کہاں رکتا؟
جھپٹ کر جا پڑا اس پر تھا اس کے سامنے کھانا

خوشی سے جھومتا پھرتا وہاں اب اونٹ بھی پہنچا
مزے لے کر اڑانے لگ گیا، تازہ، ہرا چارا

شکم سیری ہوئی گیدڑ کی تو خوش ہو اٹھا اتنا
اچھلتا کودتا کرنے لگا وہ شور ہنگامہ

گزارش، التجا کی اونٹ نے گیدڑ کو سمجھایا
ابھی تو پیٹ بھر کر میں نے چارا بھی نہیں کھایا

مچاؤ شور مت! دہقاں جو آیا، مار ڈالے گا
جو معدے میں پڑا ہے مار کر، فوراً نکالے گا

کہا گیدڑ نے کھا کر چیخنا اب اس کی عادت ہے ❊ کہ کھانا ہضم کرنے کو میاں اس کی ضرورت ہے

عجب خود غرض نکلا، اک ذرا اس نے نہ کی پروا ❊ سنی آواز گیدڑ کی تو مالک کھیت کا دوڑا

دبوچا اونٹ کو مالک نے غصے میں بہت مارا ❊ رہا کچھ دیر تک یوں ہی پڑا بے ہوش بے چارا

ہوا رخصت جو دہقاں، جھاڑ سے گیدڑ نکل آیا ❊ دکھاوے کو کیا افسوس ظاہر، خوب پچھتایا

افاقہ کچھ ہوا جو درد میں گھر لوٹنا چاہا ❊ مگر گیدڑ کو مشکل مرحلہ کچھ یوں نظر آیا

چڑھاؤ پرندی تھی، دھار پانی کی زیادہ تھی ❊ ادھر مظلوم کو گیدڑ نے آخر کر لیا راضی

بٹھا کر پیٹھ پر پانی میں اترا اونٹ بے چارا ❊ بڑی مشکل سے بیچوں بیچ ندی کے وہ جب پہنچا

لگائیں ڈبکیاں جو ہوش گیدڑ کے اڑے اک دم ❊ بھلا یہ کررہے ہو کیا؟ مرے ساتھی مرے ہمدم!

نہ ہوگا ہضم چارا گر نہ یہ کسرت دکھاؤں میں ❊ مری عادت ہی کچھ ایسی تمھیں اب کیا بتاؤں میں

کہا گیدڑ نے بھائی اونٹ، ایسا کچھ نہ تم کرنا ❊ وگرنہ اپنی قسمت میں لکھا ہے ڈوب کر مرنا

نہ مانی ایک گیدڑ کی لگائے غوطے پر غوطے ❊ کبھی گیدڑ ہوا اوپر کبھی پانی کے وہ نیچے

بالآخر کھا کے غوطے جان سے وہ ہاتھ دھو بیٹھا ❊ کیے کی اپنے گیدڑ نے سزا پائی مگر تنہا

مثل مشہور ہے یہ ''جیسی کرنی ویسی بھرنی'' بھی ❊ نسیم ایسی کرو کچھ بات، جو ہو بات عبرت کی

Nasim Azizi
172, GT Road (south)
Howrah - 711102

بے غم وارثی

کتنی پیاری زبان ہے اردو

کتنی پیاری زبان ہے اُردو
جسم میں جیسے جان ہے اُردو

عہد ماضی سے عہد حاضر تک
قوم و ملت کی شان ہے اُردو

ہے یہ ہندوستان کی تہذیب
آج جو درمیان ہے اُردو

میکدہ یا سخن کی ہو محفل
ہر جگہ میزبان ہے اُردو

ایک شیریں زبان ہو کر بھی
کس قدر بے زبان ہے اُردو

ذہن و دل سے جو مٹ سکے نہ وہ
ایک انمٹ نشان ہے اُردو

Begham Warsi
Takia Parah, Howrah -711101 (W.B)

■ کیفی سنبھلی

پرندہ اور انسان

بچہ:
ہوتا جو میں پرندہ
پھر پھر ہوا میں اڑتا
پیسے نہ دینے پڑتے
پھل کھاتا مفت میٹھے
پیڑوں کی چوٹیوں پر
آرام کرتا اکثر
جی بھر کے چہچہاتا
کوئی بھی چھو نہ پاتا
سب مجھ سے پست ہوتے
ہوتا بلند سب سے

باپ:
ہوتے جو تم پرندے
بلبل بیٹر طوطے
اک دو روپے کے بدلے
بازار میں ہی بکتے
حالت پہ اپنی روتے
پنجرے میں بند ہوتے
احساں کیا ہے تم پر
انساں تمھیں بناکر
شکر خدا کرو تم
اس کا ہی دم بھرو تم

Kaifee Sambhali
Numbardar House
Nooriyon Sarai, Sambhal (U.P)

سائنسی کہانیاں

مترجم: انیس الدین ملک

اولین غبارے

اسٹیفن اور جوزف مونٹ گولیفر دو بھائی تھے جو انویان میں ایک بڑے کاغذ کی فیکٹری کے مالک تھے۔ انویان دریائے رہوں کے کنارے ایک قصبہ تھا۔ دونوں بھائیوں کو اڑان سے متعلق مطالعے سے دلچسپی تھی۔

ان کو معلوم تھا کہ اگر کاغذ کے بڑے تھیلے کو بھاپ سے بھر دیا جائے جو اتنا ہلکا ہو جتنا بادل تو یہ بادل کی مانند ہوا میں تیرے گا۔ پانچ جولائی 1783 کو ایک بڑی بھیڑ ان دونوں بھائیوں کے تصور کو عملی تجربہ کی شکل میں دیکھنے کے لیے اکٹھا ہوئی۔ ایک گولے کی شکل میں 35 فٹ قطر کے کاغذ کے تھیلے کو ایک بڑی بلی کے اوپری سرے پر باندھ دیا گیا اور تھیلے کے کھلے منہ کے نیچے لکڑی اور بھوسے کا ڈھیر رکھا گیا۔ اس ڈھیر کو آگ لگا دی گئی جس کے نتیجے میں دھواں تھیلے میں پھیل کر اوپر پورے گولے میں بھر گیا۔ اس تھیلے کو آزاد چھوڑ دینے پر یہ تیزی سے ہوا میں اوپر کی طرف اٹھا اور دس منٹ سے کم عرصہ میں یہ چھ ہزار فٹ کی اونچائی تک چلا گیا۔ لیکن جلد ہی یہ نیچے کی طرف آنے لگا اور آخر میں ایک انگور کے باغ میں اتر گیا۔

پروفیسر چارلس نے جو ایک ممتاز فرانسیسی سائنسداں تھا، اس غیر معمولی تجربے کے بارے میں سنا اور ایک اہم تبدیلی کے ساتھ اس کو دوہرانے کا فیصلہ کیا۔ اسے اس بات کا علم تھا کہ برطانوی سائنسداں کیونڈش کا کہنا ہے کہ نئی دریافت کی ہوئی گیس جسے اب ہائیڈروجن کہتے ہیں ہوا سے دس گنا ہلکی ہے (اصلیت میں یہ 17½ گنا ہلکی ہے) اس لیے چارلس نے گرم ہوا اور دھواں بھرنے کے بجائے ہائیڈروجن گیس استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس زمانے میں ہائیڈروجن کو لوہے

اور گندھک کے ہلکے تیزاب کے عمل سے بناتے تھے۔

چارلس نے اپنے منصوبوں کا اعلان کیا اور عوام سے ضروری اشیاء خریدنے کے لیے چندہ مانگا۔ دو بھائی جن کا نام روبرٹس تھا۔ انھوں نے ریشم کا ایک کرہ بنایا جس کا قطر تقریباً 13 فٹ تھا اور اس گیس کو روک بنانے کے لیے اس کے اندر گوند کا روغن کردیا۔

ہائیڈروجن کو ایک ہزار پونڈ لوہا اور پانچ سو پونڈ گندھک کا تیزاب ملاکر بنایا گیا۔ ان کو ایک برتن میں جو خصوصی طور سے اس مقصد کے لیے بنایا گیا تھا رکھا گیا۔ اس برتن سے پائپ کو تھیلے کے منہ کی طرف لے جایا گیا۔ اس ریشم کے تھیلے کو بیلون کہا گیا۔

اس تجربے نے بہت سارے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور لوگ 23 اگست کو غبارے بھرنے کے عمل دیکھنے آئے۔ بھیڑ اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ غبارے کو ایک کھلی جگہ چیپ ڈی مارس جو دو میل دور تھا لے جایا گیا۔ وہاں اسے خفیہ طور سے لے جایا گیا۔ ایک چشم دید گواہ نے اسے ہٹانے اور لے جانے کا بیان کیا ہے۔

غبارے کو لے جانے کا منظر ایسا تھا کہ کوئی اس سے زیادہ حیرت انگیز منظر تصور نہیں کرسکتا۔ آدمی جلتی ہوئی مشعلوں کے ساتھ چل رہے تھے اور پیادہ سپاہیوں کا دستہ اور گھوڑ سوار بھی ساتھ ساتھ تھے۔ رات کا یہ مارچ ریشم کے کرہ کی شکل اور جسامت جسے اتنی حفاظت سے لے جایا جارہا تھا، خاموشی جو اس وقت طاری تھی اور یہ نامناسب وقت۔ یہ سب ان لوگوں پر جو اس کی حقیقت سے ناواقف تھے ایک غیر معمولی پراسرار اثر ڈال رہے تھے۔ جب جلوس گزر رہا تھا تو کوچوانوں نے سڑک پر متحیر ہوکر اپنی بگھی روک لی اور ٹوپی اپنے ہاتھ میں لے کر عاجزی کے ساتھ جھک گئے۔

دوسرے دن اڑان کے میدان میں لوگوں کی اتنی زیادہ بھیڑ تھی کہ فوج کی ایک بڑی تعداد کو جھگڑے فساد کو روکنے کے لئے بلایا گیا۔ سہ پہر کو پانچ بجے توپ سے گولہ داغ کر اشارہ دیا گیا۔ رسیاں جو کہ کرہ کو باندھے ہوئے تھیں کاٹ دی گئیں۔ یہ اوپر کی جانب اٹھا اور دو منٹ سے کم عرصہ میں تقریباً تین ہزار فٹ اوپر اٹھ گیا۔ وہ ایک بادل میں جا گھسا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد پھر نظر آیا، پھر اور زیادہ اونچائی پر جانے لگا اور آخر کار بھاری بارش میں دوسرے بادلوں میں کھو گیا۔ فضائے بسیط میں ایک شے کا چلنا اتنا پُر لطف تھا اور یہ روزمرہ کے نظاروں سے اتنا مختلف تھا کہ تماشائی جوش کے مارے آپے سے باہر ہو گئے تھے۔ لوگ اتنے زیادہ بے قرار تھے کہ عورتیں، جنھوں نے جدید فیشن کے کپڑے پہن رکھے تھے، نے اپنے آپ کو بارش میں بھیگنے دیا تا کہ کرہ کو آخری لمحے تک دیکھتی رہیں۔

اس غبارے سے بندھا ہوا ایک چمڑے کا تھیلا تھا جس میں ایک کاغذ رکھا ہوا تھا اس میں اڑنے کا دن اور وقت لکھا ہوا تھا اور یہ درخواست کی گئی تھی کہ اگر یہ کسی کو ملے تو یہ پروفیسر چارلس کو واپس کر دیا جائے۔

چارلس کا خیال تھا کہ اس نے اتنی مقدار میں ہائیڈروجن بھری ہے کہ جو غبارے کے لیے ہوا میں 20 سے 25 دن تک اڑنے کے لیے کافی ہوگی۔ لیکن تین چوتھائی گھنٹے کی پرواز کے بعد غبارہ پیرس سے پندرہ میل دور گونیسے گاؤں میں ایک کھیت میں جا گرا۔ غبارہ تقریباً 20 ہزار فٹ کی اونچائی تک گیا اور اس اونچائی پر باہر کی ہوا کا دباؤ اندر بھری ہائیڈروجن سے بہت کم تھا اس لیے ہائیڈروجن کے زیادہ دباؤ نے کپڑے کو پھاڑ دیا اور غبارہ زمین پر اسی لیے گرا کیونکہ سوراخ سے گیس نکل گئی۔

اخبار کی مندرجہ ذیل اطلاع کے مطابق دیہاتی اس عجیب و غریب شے کو آسمان سے گرتا دیکھ کر خوف سے سہم گئے۔

"اس کو دو کسانوں نے گرتا دیکھا اور وہ سمجھے کہ آسمان سے اڑتا ہوا ایک دیو نیچے اتر رہا تھا۔ اس خیال کو اور بھی زیادہ تقویت ملی جب غبارے نے گرنے کی تیز رفتار کی وجہ سے زمین پر ساکت ہونے سے قبل کئی بار ٹپا کھایا۔ ان حرکات نے کسانوں کو یہ یقین دلا دیا کہ یہ ایک حیوان تھا جو زندہ تھا اس لیے ان کی اس کے قریب جانے کی ہمت نہیں ہوئی اور وہ کچھ دیر تک کھڑے ہو کر اس پر پتھر پھینکتے رہے۔ اس طرح جب انھوں نے ریشم کے کرہ کو پوری طرح سے پھاڑ دیا تو غبارہ

بالکل ساکت ہوگیا۔ تب ان دونوں میں سے ایک زیادہ ہمت والا آگے بڑھا اور تعجب سے دیکھا کہ حیوان نے اپنے جبڑے کھول دیے ہیں۔ اس نے دیو کے دانتوں کے خیال سے ڈر کر اس کے منہ میں اپنا ہاتھ ڈالنا خطرے سے خالی نہیں سمجھا۔ اس نے احتیاط سے جھانک کر پہلے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہائیڈروجن (جو خالص نہیں تھی) کی بدبو ابھی منتشر نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اس کو اپنا سر پیچھے ہٹانا پڑا۔ اس کے ساتھی نے اس کو دیکھا اور یہ سمجھ کر کہ حیوان نے اس کو کاٹ لیا ہے، تیزی سے دور بھاگنے لگا۔ لیکن دوسرا آدمی چلایا اور یہ بتایا کہ اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے اور حیوان مر چکا ہے لیکن بدبو سے سڑ رہا ہے۔ اب ان کی ہمت بندھی اور انھوں نے غبارے کو قریب ہی چرتے ہوئے ایک خچر کی دم سے باندھا اور گھسیٹتے ہوئے گاؤں کی طرف لے چلے۔ وہ پادری کے دروازے پر رکے اور اس قابلِ تعظیم بزرگ سے درخواست کی کہ وہ اس جادو کے حیوان کا مطالعہ کریں۔ اس نے چمڑے کے تھیلے کو دریافت کر لیا اور اس کے اندر رکھے ہوئے کاغذ کو پڑھا جس میں غبارہ بنانے والے کا نام، اس کا مقصد اور کس کو یہ بھیجنا ہے اس کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ دونوں کسان بہت خوش ہوئے انھیں امید تھی کہ انھیں اس محنت کا اور خطرناک کام کا ضرور انعام ملے گا۔"

اس سلسلے میں ایک اور بیان دیہاتیوں کے متحیر ہونے کے بارے میں ہے۔

"پہلی نظر میں بہت سے لوگوں کے خیال میں یہ کسی دوسری دنیا سے آئی کوئی دیونما چڑیا تھی۔ جب اتری تو اس میں گیس ہونے کی وجہ سے حرکت تھی۔ کچھ لوگوں نے ہمت کی اور ایک گھنٹے تک آہستہ آہستہ آگے بڑھے اس امید پر کہ دیو پرواز کرے گا۔ آخر کار ان میں سب سے زیادہ ہمت والے آدمی نے بندوق سنبھالی اور اس کے کافی قریب آ کر اس پر گولی چلائی اور دیو کو مسکراتے ہوئے دیکھا اور اپنی فتح مندی پر چلایا۔ ایک نے کھال سمجھ کر اسے چھپایا۔ زہریلی بدبو سونگھی اور سارے لوگ ہٹ گئے۔ انھوں نے غبارے کو گھوڑے کی دم میں باندھا اور گھوڑا قلانچے مارتا ہوا گاؤں کی طرف بڑھا اور اس کی دھجیاں بکھر گئیں۔"

مشہور امریکی سائنسداں اور سیاستداں فرینکلین نے جس نے غبارے کی پہلی اڑان دیکھی تھی، غبارے کو جنگ میں استعمال کرنے کے امکان پر غور کیا۔ اس نے لکھا: پانچ ہزار غبارے جن میں سے ہر ایک دو آدمیوں کو لے جا سکے، قیمت میں پانچ جہازوں سے زیادہ نہیں پڑیں گے اور کہاں ہیں وہ بادشاہ جو اپنے ملک کے تحفظ کے لیے اتنے فوجیوں کا انتظام کر سکیں جو بادلوں سے اترے ہوئے دس ہزار آدمیوں کا مقابلہ کر سکیں۔

پس اس نے جنگ میں پیراٹروپ کے استعمال کی 150 سال قبل ہی پیش گوئی کر دی تھی۔ کچھ فرانسیسی پریشان تھے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ انگلستان جو ہمارا رقیب ہے، سمندر پر

برتری حاصل کرنے کی طرح ہوا میں بھی ہم سے سبقت لے جائے گا لیکن انگلستان کے لوگوں کو خدشہ تھا کہ اس پر حملہ کے خلاف جو قدرتی پشت پناہ انگلش چینل کی ہے، اب دشمن کو ان کے ساحلوں پر پہنچنے سے نہیں روک سکے گی۔ ایک مشہور کارٹون 1784 میں کھینچا گیا جس کا عنوان تھا ''مونگو بادلوں میں'' اس میں دکھایا گیا تھا کہ فرانسیسی موجد پھونک کر صابن کے بلبلے نکال رہا ہے جو غباروں کو ظاہر کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے:

''خدا کی قسم یہ ایک زبردست ایجاد ہے، یہ میرے بادشاہ کو، مجھے اور میرے ملک کو غیر فانی کردے گی۔ ہم اپنے دشمنوں کے خلاف جنگ کا اعلان کردیں گے۔ خدا کی قسم ہم ان کو ہلا دیں گے۔ ہم ان کی چھاؤنیوں کا معائنہ کریں گے اور ان کے جنگی جہازوں کے بیڑے کو راستے میں روک لیں گے۔ ہم ان کی بندرگاہوں کو آگ لگا دیں گے۔ خدا کی قسم ہم جبرالٹر لے لیں گے۔ ہوا کے غباروں سے ہم نہ صرف انگلستان بلکہ دوسرے ممالک بھی فتح کرلیں گے اور ان کو بادشاہ سلامت کی نوآبادیاں بنالیں گے۔''

1804 میں دو فرانسیسی سائنس داں بہت سے سائنسی آلات کے ساتھ یہ دریافت کرنے کے لیے ایک غبارے میں بیٹھے کہ کیا اونچائی پر مقناطیسی سوئیوں کا رویہ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا زمین پر۔ اس پرواز کے دوران ایک واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے ایک لاعلم گڈریہ لڑکی یہ سمجھ بیٹھی کہ ایک معجزہ کا ظہور ہوا۔

کچھ سال بعد 1792 میں اولین غباروں کی پرواز کے تجربوں کا دلچسپ طور سے خاتمہ ہوا۔ اس وقت فرانسیسی اپنے بادشاہ کے خلاف پوری طرح سے بغاوت کرچکے تھے اور دس اگست کے یادگاری دن پیرس کے باشندے پوری طرح سے بادشاہ کی ماتحتی سے آزاد ہوگئے۔ انھوں نے شاہی محل پر حملہ کردیا اور بادشاہ کے محافظ سپاہیوں کو قتل کردیا اور آخیر میں بادشاہ کو قیدی بنالیا۔ اس کو جیل میں بند کردیا گیا اور عدالتی تحقیقات کے بعد اس کو موت کی سزا ملی اور جلاد مشین سے اس کا سر اڑا دیا گیا۔

اس یادگاری دن پروفیسر چارلس شاہی محل میں رہ رہا تھا کیونکہ بادشاہ نے اسے اس کے سائنسی کارنامے کے بدلے میں انعام واکرام کے ساتھ مفت شاہی رہائش بخشی تھی۔ مجمع محل میں گھس کر ہر خاص وعام کا قتل کرنے لگا اور کچھ لوگوں کے ہاتھ چارلس آگیا۔ وہ اس کو مارنے ہی والے تھے کہ اس نے ان کو یاد دلایا کہ وہ چند سال قبل اس کے غباروں کی پرواز دیکھ کر خوش ہوئے تھے۔ مجمع میں سے کچھ لوگوں نے اسے پہچان لیا اور اس کی جان بخش دی۔ وہ انقلاب کے دور سے سلامتی کے ساتھ گزرا اور 1823 تک زندہ رہا۔

فرنیکلن نے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، پیراٹروپ کے

استعمال کی پیش گوئی کی تھی۔ ہوا میں لڑائی کی جھلک اس کے تھوڑے ہی دن بعد دیکھنے میں آئی جب 1808 میں دو آدمی پہلی بار مقابلہ آور ہوئے۔ انھیں معلوم تھا کہ پہلی بار لڑنے میں بھی کسی ایسے ہتھیار کا جس سے صرف ایک بار نشانہ داغا جاسکے گا استعمال بیکار ہے۔ اس لیے دونوں کے پاس بڑے منہ کی چھوٹی بندوقیں تھیں جس کی ایک بار لبلبی دبانے سے کئی گولیاں نکلتی تھیں۔ دونوں جنگِ عظیم میں مشین گن استعمال کی گئی تھیں جو بے شمار گولیاں ہوا میں دور تک بوچھار کرتی تھیں تا کہ ان میں سے کم سے کم ایک نہایت اہم مقام پر لگ سکے۔

دو آدمی ایم ڈی گرانڈ پیرے اور ایم لابی کی ایک ایکٹریس پر لڑ پڑے جیسا کہ اس زمانے کا دستور تھا۔ اس طرح کے معاملے کا فیصلہ ایک ڈوئل کے ذریعے ہوتا تھا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بالکل یکساں غبارے میں بیٹھ کر ہوا میں ڈوئل لڑیں گے۔ اس سلسلے میں جب ساری تیاریاں مکمل ہوگئیں تو دونوں ڈوئل لڑنے والے اپنی بندوق کے ساتھ غبارے کے لٹکن میں بیٹھ گئے۔ دونوں غباروں کو اس طرح رکھا گیا کہ اڑنے پر ان کا فاصلہ 80 گز کے قریب ہو۔ ایک بڑے مجمع کی موجودگی میں دونوں غباروں کو اتارا گیا۔ جب غبارے کافی بلندی پر پہنچ گئے تو بندوق سے گولی چلانے کا اشارہ کیا گیا۔ ایم لابی نے پہلی گولی داغی لیکن نشانہ خطا کر گیا۔ غبارہ پھٹ گیا اور اس کے نیچے بیٹھنے والے کا لٹکن گر گیا۔ اس کے گرنے کی رفتار زمین پر پہنچتے پہنچتے بہت تیز ہوگئی اور یہ زمین سے ٹکرا کر تباہ ہوگیا۔ ایم لی پی تی اور ان کے ڈبل کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے اور ایم ڈی گرانڈ پیرے اور ان کا ڈبل ہوا میں اڑتا رہا۔ جب تک غبارہ پیرس سے 20 میل زمین پر نہ آ گیا۔

سائنس دانوں کو جلد ہی یہ انکشاف ہوا کہ غباروں کے استعمال سے فضا کے اوپری حصے کا مطالعہ ہو سکے گا۔

1804 میں دو فرانسیسی سائنس داں بہت سے سائنسی آلات کے ساتھ یہ دریافت کرنے کے لیے ایک غبارے میں بیٹھے کہ کیا اونچائی پر مقناطیسی سوئیوں کا رویہ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا زمین پر۔ اس پرواز کے دوران ایک واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے ایک لاعلم گڈریا لڑکی یہ سمجھ بیٹھی کہ ایک معجزہ کا ظہور ہوا۔

غبارہ تقریباً 7000 فٹ کی اونچائی تک گیا لیکن دونوں سائنس داں اور اونچا جانا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے بہت سی چیزیں جو اپنے ساتھ لائے تھے نیچے پھینکنی شروع

کر دیں۔ ان چیزوں میں سے ایک بھونڈی سی سفید رنگ کی لکڑی کی کرسی بھی تھی۔ یہ زمین پر گری اور جھاڑیوں میں رک گئی۔ گرتے وقت گڈریوں سے ٹکراتے ہوئے بال بال بچی۔ متحیر ہوکر اس لڑکی نے آسمان سے گرتی ہوئی چیز دیکھی۔ اس کا بیان ایک مشہور فرانسیسی سائنسداں نے کیا ہے۔ وہ غباروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس دن سمجھا کہ اس کے لیے فرشتوں نے آسمان سے کرسی بھیجی ہے اس غیر معمولی واقعے کی کوئی دوسری وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے اس کو جھاڑیوں میں سے نکالا۔ لیکن اس کی طفلانہ کاریگری دیکھ کر اس کو تعجب ہوا۔ اس نے سوچا کہ یقیناً فرشتے اس سے بہتر فرنیچر بنا سکتے تھے۔ یہ معمہ اس وقت حل ہوا جب ایک اخباری کتابچہ نے اس اڑان کی تفصیلات دیں اور ان اشیا کا ذکر کیا جو سائنسدانوں نے باہر پھینکی تھیں۔

چارلس کا غبارے کو ہائیڈروجن سے بھرنے کا خیال کوئی نیا نہیں تھا۔ کیونکہ ایڈینبرگ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر جوزف بلیک نے کچھ سال پہلے ایسا کیا تھا۔

1776 میں بلیک کو کیونڈش کی ہائیڈروجن کی دریافت کا حال معلوم ہوا تھا اور اس کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ نئی گیس سے بھرا ہوا غبارہ ہوا سے ہلکا ہوگا اس لیے جب اس کو آزاد چھوڑا جائے گا تو یہ اوپر اٹھے گا۔ اس نے سوچا کہ اپنی مرضی سے ایک گیس سے بھرے پھکنے کا اُٹھنا بہت حیرت انگیز ہوگا۔ اس نے اپنے دوستوں کو کھانے پر مدعو کیا اور کھانے کے بعد ہائیڈروجن سے بھرے پھکنے کو ہوا میں اڑا دیا۔ اس طرح اس کے دوست وہ پہلے لوگ تھے جنھوں نے ایک غبارے کو ہوا میں اڑتے دیکھا۔ انھیں تعجب ہوا کہ کس طرح بلیک نے غبارے کو چھت تک پہنچانے میں اپنی عقل اور سمجھ کا استعمال کیا۔ اس کا ایک ممکن طریقہ اس شام کی تفریحات میں اس طرح پیش کیا گیا:

''ہائیڈروجن کی دریافت کے بعد جلد ہی یہ بتایا گیا کہ یہ گیس ہوا سے دس گنا ہلکی ہے۔ ڈاکٹر بلیک نے اپنے دوستوں کو کھانے پر مدعو کیا اور اطلاع دی کہ وہ انھیں کچھ دکھانے کے لیے بیتاب ہے۔'' ڈاکٹر ہٹن، مسٹر کلارک آف ایلڈن اور سر جارج کلارک آف پنیٹیگ ممبران تھے۔

جب سب لوگ جمع ہوگئے تو وہ ان کو ایک کمرے میں لے گیا۔ اس کے پاس گائے کے بچے کی کھال سے بنا ایک پھکنا تھا جس کو اس نے ہائیڈروجن سے بھر لیا اور اس کو آزاد چھوڑ دیا۔ وہ جلد ہی اوپر اٹھا اور اس دھاگے کو چھت سے نکال دیا۔ اس دھاگے کو اوپر سے کوئی کھینچ رہا تھا جس کی وجہ سے غبارہ چھت تک اٹھ کر ایک خاص جگہ پر آگیا تھا۔ یہ تشریح ایسی برجستہ اور لگتی ہوئی تھی کہ تمام لوگوں نے اس کو مان لیا۔ گرچہ یہ اور دوسری تشریحات کی طرح معقول لگتی ہے لیکن یہ بالکل بے بنیاد لگتی ہے۔ جب پھکنے کو نیچے لایا گیا تو اس میں دھاگا وغیرہ کوئی چیز بندھی ہوئی نہیں تھی۔ ڈاکٹر بلیک نے اس کے اوپر جانے کی وجہ کی تشریح اپنے مداح دوستوں سے کی۔ لیکن یہ ڈاکٹر بلیک کی اپنی شہرت سے بے رخی اور لوگوں کو اطلاع پہنچانے میں لاپروائی تھی کہ انھوں نے اس تجسس پیدا کرنے والے تجربے کے بارے میں اپنے ساتھیوں کو بھی نہیں بتایا۔ اور بارہ سال سے زیادہ عرصے کے بعد ہائیڈروجن گیس کی اس خاصیت کو پیرس میں ایم چارلس نے غباروں کو ہوا میں اڑانے میں استعمال کیا۔''

(قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب 'سائنس کی کہانیاں' سے ماخوذ)

نظم

احمد امام

علم

علم سے ہے وقار دنیا میں
علم سے ہے نکھار دنیا میں

علم دولت ہے کارخانوں کی
علم رونق ہے خاندانوں کی

علم کی دین ٹیلی ویژن ہے
علم ہی جانِ فکر ہے فن ہے

علم سے بن رہے ہیں میزائل
علم سے چل رہے ہیں موبائل

علم سے فیکس کا ظہور ہوا
علم سے راستے میں نور ہوا

علم نے حوصلہ بڑھایا ہے
علم نے راستہ دکھایا ہے

علم نے سارے جگ میں نام کیا
علم نے چاند پر قیام کیا

علم کی کھوج میں رہو بچو
علم سے دوستی کرو بچو

Ahmad Imam
Churi Mahel, Balapur
Akola - 444302, Maharashtra

پانی رے! پانی رے!

■ ڈاکٹر محمد ارشد خان

ہلمل کالونی کی دس منزلہ عمارت سورج کی پہلی کرن کے ساتھ جاگ اُٹھتی تھی۔ لوگوں کو آفس جانے کی جلدی، بچوں کو اسکول بھاگنے کی ہڑبڑی، دودھ والے اور اخبار والے کی آوازیں ایک ہلچل سی پیدا کر دیتیں۔ لیکن دس بجتے بجتے کالونی پھر سونی ہو جاتی۔ سب اپنے اپنے کام پر چلے جاتے۔ دھوپ کے ساتھ ساتھ سنّاٹا بھی پسر جاتا۔

ایسی ہی ایک سنہری صبح تھی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی چل رہا تھا کہ اچانک...

''ارے، پانی کس نے بند کر دیا؟'' بترا انکل صابن لگی آنکھیں پچ مچاتے ہوئے چلائے۔

''پانی کون بند کرے گا بھلا؟'' آنٹی کچن سے بڑبڑائیں۔ پھر انھوں نے باہر آ کر واش بیسن کا پائپ کھولا تو حیران رہ گئیں۔ پانی سچ مچ چلا گیا تھا۔

کالونی میں آئے اُنھیں پانچ سال ہوئے تھے۔ ان پانچ

برسوں میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ پانی کا انتظام بہت اچھا تھا۔ ہرکھو بڑے سویرے آ کر پمپ چلا دیتا تھا۔ لوگ خوب پانی بہاتے، نہاتے دھوتے، پیڑ پودے سینچتے، گھر کی دھلائی کرتے، گاڑیاں دھوتے، اکثر باتھ روم کا نل کھلا چھوڑ دیتے، لیکن پانی کی کبھی کمی نہیں ہوتی تھی۔ کسی کو شکایت نہیں تھی۔

''ارے بھئی۔ میں لیٹ ہو جاؤں گا''، بترا انکل پھر چیخے۔

پر اس سے پہلے کہ آنٹی جواب دیتیں، دروازے پر مسز بہل کی آواز سنائی دی۔ ''دیدی، کیا آپ کے یہاں پانی آرہا ہے؟''

آنٹی کا دل دھڑک گیا۔ باتھ روم کے اندر بترا انکل نے سنا تو نامعلوم خوف سے کانپ اُٹھے۔

آنٹی صورتِ حال کا جائزہ لینے بالکنی کی طرف بڑھ آئیں۔ پمپ ہاؤس کے پاس بھیڑ لگی تھی۔

''کیا ہوا؟'' پمپ ہاؤس کی سمت اشارہ کرتے ہوئے آنٹی نے واچ مین سے پوچھا۔

واچ مین سن تو نہیں پایا پر اشارہ بھانپ گیا۔ اس نے اشاروں میں ہی ساری بات سمجھانے کی کوشش کی۔ پر آنٹی کچھ سمجھ پاتی کہ نچلی منزل سے ڈاکٹر رحمان کی آواز آئی، ''میڈم پمپ خراب ہو گیا ہے۔''

پمپ خراب ہونے کی خبر کالونی میں باڑھ کے پانی کی طرح پھیل گئی۔ ہر طرف افراتفری سی مچ گئی۔ سنگھ صاحب نے کار دھونے کے لیے صابن لگا رکھا تھا۔ اب اس کا جھاگ سوکھ کر داغ چھوڑنے لگا تھا۔ کپڑا لے کر جھاگ پونچھتے ہوئے وہ نوکر پر چیخ رہے تھے۔

بھنڈاری انکل شیونگ کرتے وقت واش بیسن کا نل کھلا رکھتے تھے۔ ابھی آدھی شیو ہی بنی تھی کہ پانی بوند بوند ٹپکتے ہوئے بند ہو گیا۔

ماتھر انکل آج صاف صفائی کے موڈ میں تھے۔ صبح صبح پورے گھر کی جھاڑ پونچھ کی تھی جس سے ہر جگہ دھول ہی دھول ہو گئی تھی اب دھلائی کے لیے ہاتھ میں پائپ پکڑے خود کو کوس رہے تھے۔

ہر کوئی پریشان تھا۔ بنا نہائے پنڈت جی کی پوجا چھوٹی جا رہی تھی۔ ورما آنٹی کے کپڑے بنا دھلے رہ گئے تھے۔ کبّن بابا کا چھوٹے سے گملے میں لگا بڑا اریکریا سوکھا جا رہا تھا۔ مسز ٹنڈن کے گھر تو چائے بننے بھر کو بھی پانی نہیں تھا۔

''ارے، کالونی کے باہر لگے ہینڈ پمپ سے پانی منگواؤ۔'' بترا انکل بے چارگی سے چیخے، ''پپو کو بھیجو۔ آج آفیسر کا دورہ ہے۔ لیٹ ہوا تو مشکل میں پڑ جاؤں گا۔''

باہر ہینڈ پمپ پر لوگوں کے ساتھ ساتھ بالٹیوں، مٹکوں، پیپوں اور ڈبّوں کی قطار بھی لگی ہوئی تھی۔

تبھی مسز ملہوترا بھیڑ کو چیرتی ہوئی آئیں اور بولی، ''ہٹو'' لیڈیز کو پہلے پانی لینے دو''

''نہیں نہیں ضرورتیں سب کی برابر ہیں۔ بنا لائن میں لگے کسی کو پانی نہیں ملے گا۔'' کوئی چیخا۔

''ہاں۔ ہاں بالکل صحیح،'' بھیڑ نے زوردار ہاں میں ہاں ملائی۔

بھیڑ کے ہنگامے پر مسز ملہوترا اسٹ پٹا گئیں۔ وہ گھبرا کر سڑک کے اُس پار قطار کے آخر میں جا کر لگ گئیں۔

''ارے، دیکھو۔ دیکھو۔ ڈاکٹر صاحب دوسری بالٹی بھر رہے ہیں۔'' تبھی ایک نے چلاّ کر کہا۔

''اجی سب کو جلدی ہے۔! کام پر سب کو جانا ہے۔ جسے ایک بالٹی سے زیادہ پانی بھرنا ہو وہ دوبارہ قطار میں لگے۔'' بھیڑ نے شور مچایا۔

ڈاکٹر رحمان دوسری بالٹی آدھی خالی لے کر کھسیائے ہوئے ہٹ گئے۔

گوتم انکل اپنا پیپا چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لیے ہٹے ہی تھے کہ ان کی جگہ ورما جی آ کر کھڑے ہو گئے۔ گوتم انکل کی بھنویں تن گئیں۔ بات بڑھ گئی۔ تو تڑاک ہونے لگی۔ بھیڑ شور مچانے لگی۔ اُنھیں روکنے کے بجائے سب تماشا دیکھنے لگے۔ سیانے لوگ لائن توڑ کر نل کی طرف بھاگے۔

تبھی شرما انکل کا لڑکا راجیش دس لیٹر کا پانی بھرا پیپا موٹر سائیکل کی ہینڈلوں کے بیچ رکھ کر لاتا دکھائی دیا۔ بھیڑ بیتاب ہو اُٹھی۔ ''کہاں سے لائے؟'' ''پاس ہے کہ دور؟'' تمام طرح کے سوال اچھلنے لگے۔

راجیش فخر سے سر تان کر بولا۔ ''رجب کی نرسری کے پاس ٹیوب ویل چل رہا ہے۔ وہیں سے لایا ہوں۔ یہاں لائن میں بھلا کون لگتا؟''

''ارے سنگھ صاحب، کار نکالیے۔'' سہائے انکل بولے ''چلیے، ہم لوگ بھی چل کر وہیں سے لے آتے ہیں۔ ورنہ آج حاضری رجسٹر پر کراس لگا جائیے۔''

''نہیں بھائی جتنے کا پانی نہیں اُس سے زیادہ کا پٹرول خرچ ہو جائے گا۔ میرا نمبر تو ویسے ہی آنے والا ہے۔''

''مکھی چوس'' سہائے انکل بدبدائے۔ آس پاس کے لوگ مسکرا دیے۔

ایک ایک کر کے لوگ پانی بھرتے جا رہے تھے۔ پر لائن تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

''سب غلطی اس کمبخت ہر کھو کی ہے۔'' مرزا رشید دھوبی کا غصّہ گدھے پر اُتارتے ہوئے بولے۔ ''ابھی تک پمپ ہی نہیں ٹھیک کرا پایا۔''

''ہاں ہاں! بالکل اسے پہلے سے چیک کرتے رہنا چاہیے تھا۔ غلطی اس کی ہے۔'' بھیڑ نے سُر میں سُر ملایا۔

''بنا سختی کے ٹھیک نہیں ہوگا۔''

''ہاں ہاں! چلو، اسے درست کرتے ہیں۔''

''بھیڑ پمپ ہاؤس کی طرف بڑھ چلی۔ لوگوں کی چیخ پکار سن کر ہاتھ میں پیچکس، ہتھوڑی لیے، تیل اور کالکھ میں سنا، ہرکھو باہر آیا اور بولا'' آپ لوگ خاموش ہو جائیں۔ پمپ ٹھیک ہوگیا ہے۔''

لوگ خوشی سے اچھل پڑے، پل بھر میں خبر پھیل گئی۔ لوگ فوراً اپنے اپنے فلیٹ کی سمت بھاگے۔

تھوڑی دیر میں کالونی پھر سے اپنے ماحول میں واپس آ گئی۔ سنگھ صاحب نے کار کو رگڑ کر صاف کرنا شروع کر دیا۔ بھنڈاری انکل نے واش بیسن کا پائپ کھول دیا اور شیونگ کرنے لگے۔ ماتھر انکل فرش پر بھر بھر کر بالٹی پھینکنے لگے۔

رُکے ہوئے سارے کام پھر سے شروع ہو گئے۔

ادھر ایک کپڑے سے کالکھ پونچھتے ہوئے ہرکھو سوچ رہا تھا۔'' کالونی کا پمپ خراب ہوا تو پھر سے بن گیا۔ پر کبھی اس زمین کا پمپ خراب ہو گیا تو...؟''

Dr. Mohammad Arshad Khan
Asst. Professor G F College,
Shahjahanpur-242001

سیر و تفریح

■ صلاح الدین احمد

مانسر جھیل کی سیر

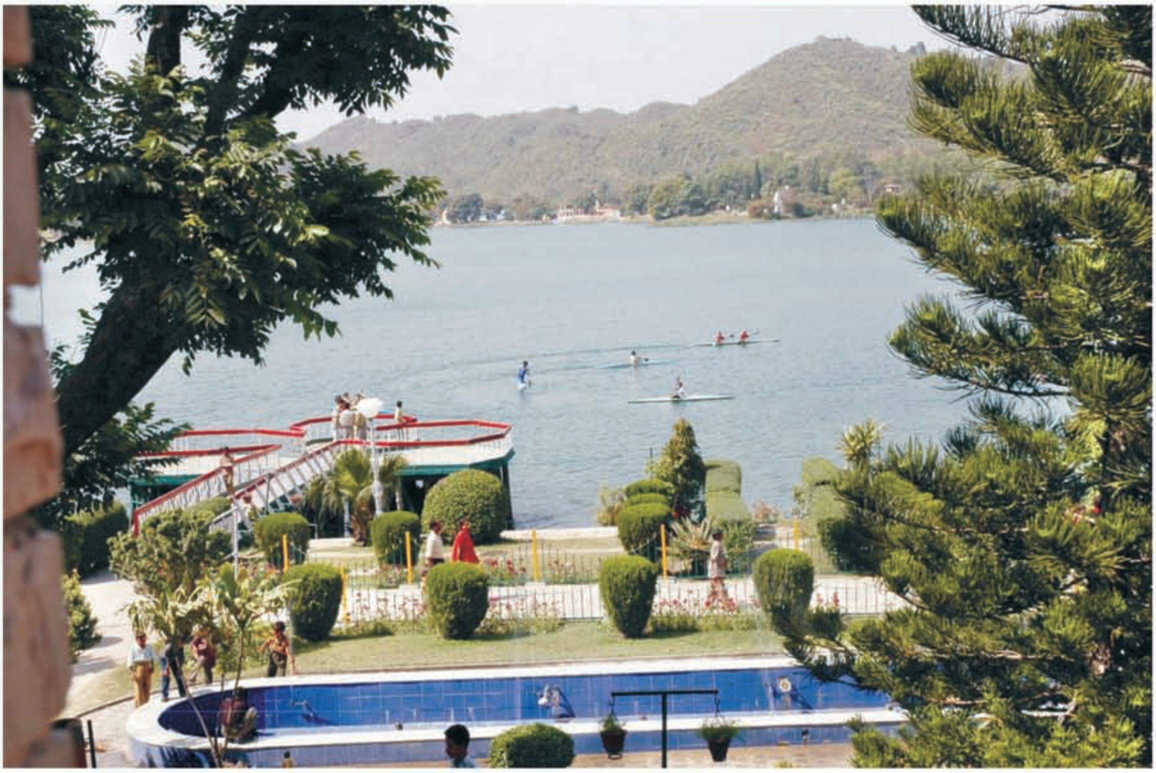

جس طرح ریاست جموں و کشمیر میں وادیِ کشمیر قدرتی حسن سے مالا مال ہے اور اس میں ڈل جھیل کی خوبصورتی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے اسی طرح جموں میں مانسر جھیل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ وہاں پہنچنے کے لیے سانبہ جانا ہوتا ہے جو جموں شہر کے جنوب میں 59 کلومیٹر دور ہے۔ یہ راستہ لمبا اور سیدھا ہے جس پر گاڑیاں 60 کلومیٹر کی رفتار سے بہت آسانی سے چلتی ہیں۔

22 کلومیٹر کا یہ راستہ پیچ دار اور کلّی طور پر پہاڑی ہے، مگر بڑا خوبصورت ہے۔ اس سے گذرنے کے بعد آپ ایک پانچ روپئے کا ٹکٹ لے کر مانسر جھیل میں داخل ہوتے ہیں۔ دروازہ پار کرنے پر آپ اس جھیل کے کنارے انتہائی خوبصورت پھولوں کے باغ میں داخل ہوجاتے ہیں۔ آپ اس کی تصویر لینا ضرور چاہیں گے۔ بچے تو اس میں بہت ہی خوش ہوں گے پھول بڑے بھی ہوتے ہیں اور چھوٹے بھی اور کئی رنگوں کے۔ جب آپ اس باغ میں دھیرے دھیرے آگے بڑھتے ہیں تو آپ کو جھیل کا کنارہ نظر آنے لگتا ہے۔

پھولوں کے باغ کی مٹی کی زمین کا ڈھلان دھیرے دھیرے نیچے جانے لگتا ہے۔ جب پانی کا کنارہ آجاتا ہے تو آپ رک جاتے ہیں۔ پانی دور تک بڑا شفاف نظر آتا ہے اور اس میں ڈیڑھ دو فٹ لمبی عام مچھلیوں سے تھوڑی سی موٹی اور اچھی دم والی مچھلیاں اندر تیرتی نظر آتی ہیں۔ وہ مچھلیاں بڑی چالاک ذہین اور عقلمند ہیں۔ یہ آپ کو اپنے آپ پتہ چل جاتا ہے ان کے طرز عمل سے۔ وہیں آپ کو کشمیری جیسے دکھائی پڑنے والے گوری چمڑی اور لال ہونٹوں والے پتلے لمبے دس سال کے اندر کے عمر والے کرتا پائجامہ پہنے انتہائی معصوم دکھائی دینے والے کئی لڑکے نظر آئیں گے جو پاس ہی کہیں کے رہنے والے ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں چھوٹی المونیم کی تھالیاں ہوتی ہیں جن میں سنے آٹے کی چھوٹی چھوٹی گولیاں ہوتی ہیں یا پھر ایک بڑی چپاتی کے لیے بنی لوئیوں جیسی آٹے کی لوئیاں رکھی ہوتی ہیں۔ ایک تھالی میں پانچ لوئیاں ہوتی ہیں۔ آپ ان سے پندرہ روپئے میں پانچ لوئیاں خرید کر ان کی چھوٹی چھوٹی مٹر کے برابر

گولیاں بنا کر ندی کے کنارے جا کر ایک ساتھ بہت سی گولیاں پانی میں پانچ فٹ آگے پھینک دیں گے تو بہت سی مچھلیاں جھپٹ کر انھیں کھا جائیں گی اور جدھر سے وہ گولیاں آ رہی ہوتی ہیں اسی جانب پانی میں اور پاس آتی ہیں تا کہ آپ آٹے کی اور گولیاں پانی میں پھینکیں۔ جب آپ پھینکتے ہیں تو وہ پھر جھپٹ کر کھا جاتی ہیں۔ اگر آپ نے گولیاں کچھ یوں پھینکیں کہ پہلے پانچ فٹ دور پھر تھوڑی کم دور پھر چار فٹ دور، پھر تین فٹ دور پھر ڈھائی فٹ دور تو مچھلیاں آپ کا مطلب سمجھ جائیں گی۔ وہ دوری زیادہ ہونے پر بڑی تعداد میں جھپٹتی ہیں۔ دوری دھیرے دھیرے کم ہو جانے پر مچھلیوں کی گولیوں پر جھپٹنے والوں کی تعداد بھی دھیرے دھیرے کم ہوتی جائے گی۔ ڈھائی فٹ دوری ہونے پر ان کی تعداد چار پانچ ہی رہ جائے گی اور اس سے ذرا کم دوری کرنے پر چند مچھلیاں ہی گولیوں کو منہ سے پکڑ لینے کے بعد پچھلے پانی میں لہرا کر اس تیزی سے جان بوجھ کر ہلیں گی کہ کنارے کے پانی کے اندر کی مٹی گھل کر شفاف پانی کو غیر شفاف بنا دیں گی جس میں کچھ نظر نہیں آئے گی۔ یہ ان کی ناراضگی کا اظہار ہے کہ انھیں آٹے کی گولیاں ڈال ڈال کر لالچ دلا کر پاس بلا کر پکڑنے کا خطرہ نہ پیدا کرو ورنہ ہم نہ آئیں گے۔ بہت سے لوگ اس طرح انھیں کنارے بلا کر اس کی اداکاری کی تصاویر اور فلمیں بھی بناتے ہیں۔ وہ مچھلیاں آٹے کی گولیاں بیچنے والے بچوں کو شکل سے پہچانتی ہیں۔ نئے سیاح کو وہ خطرہ سمجھتی ہیں۔ وہ ان بچوں کو خطرہ بالکل نہیں سمجھتی ہیں۔ وہ بچے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے انھیں ایک دم پاس بلا کر آٹے کی گولیاں کھلاتے ہیں تو وہ بے خوف و خطر کنارے آ کر پانی سے دو تین انچ منہ باہر نکال کر گولیاں ان کے ہاتھ میں سے منہ لگا کر لے جاتی ہیں۔ لوگ جب مانسر جھیل گھومنے کے لیے آتے ہیں تو کئی کئی گھنٹے ان سے یوں ہی کھیلتے رہتے ہیں پر افسوس کہ لوگ یہاں بہت کم تعداد میں آتے ہیں۔ دن بھر میں پچاس لوگ بھی دکھائی نہیں پڑتے ہیں۔ شاید اتوار کو یا چھٹی کے دن زیادہ آتے ہوں۔

مچھلیوں کو آٹا کھلانے کی جگہ (چھچھلے کنارے کی) خاصی بڑی ہے۔جھیل کے گہرے پانی کی جگہیں بھی ہیں جن کے کنارے پکے خوبصورت پلیٹ فارم بھی بنے ہیں۔ناؤ چلانے کی جگہیں بھی ہیں جہاں چھوٹی ناویں کرائے پر ملتی ہیں جن کے لیے باضابطہ قطار بھی لگتی ہے کیونکہ ناؤ کی تعداد کم ہے۔پھولوں کے باغ کے علاوہ جھیل کے اور بھی کچھ کنارے ہیں جہاں اونچے اونچے تقریباً چھ فٹ تک کے ہرے بھرے پیڑ پودے ہیں۔

گھنے پیڑ پودوں میں جنگلی چڑیاں یا اور چھوٹے جانور کبھی کبھی نظر آجاتے ہیں۔انھیں میں ایک بالکل کالی چھ انچ لمبی پتلی سی بہت شرمیلی مرغی کی نسل بھی آباد ہے۔وہ باہر کبھی کبھی نکلتی ہے پر انسانوں کو دیکھتے ہی پھر سے پیڑ پودوں کے جھنڈ میں بھاگ کر گم ہوجاتی ہے۔ایسی مرغی نہ تو کسی بازار میں ملتی ہے نہ کسی چڑیا گھر میں۔البتہ ایک اور جگہ صرف ڈل جھیل میں وہ علاقے جہاں تیرتے باغات یعنی فلوٹنگ گارڈن عرف چوری زمین ہے (مقامی زبان میں) اس میں بھی کالے رنگ کی مرغی اتنی ہی بڑی بالکل ویسی ہی دکھائی پڑتی ہے اور ویسے ہی شرما کر پیڑوں میں گم ہوجاتی ہے۔ان پر تحقیق تو ہوئی ہوگی پر مجھے کوئی مواد پڑھنے کو اب تک نہیں ملا۔وہ صرف مانسر جھیل جموں ضلع اور ڈل جھیل سری نگر ضلع میں ہی کیوں ہے۔اور کہیں کیوں نہیں؟اس پر اور لوگ اپنی معلومات سے آگاہ کریں۔

اسی مانسر جھیل کے کنارے بچوں کے لیے ایک جھولوں کا پارک بھی چھوٹا سا ہے جس کی خصوصی کشش ہے۔بجلی سے اوپر چند فٹ اٹھنے والا ہیلی کاپٹر جس کے لیے ٹکٹ لینا پڑتا ہے پر وہ شور بہت مچاتا ہے۔پاس میں ایک چائے پانی اور پھلوڑیوں و سموسوں جیسے معمولی ناشتوں کی چھوٹی سی دکان ہے بس اور کچھ دکان وغیرہ نہیں ہے وہاں۔مانسر جھیل خاصی بڑی ہے۔دیکھنے میں خوبصورت لگتی ہے۔جگہ ٹھنڈی ہے اور جموں شہر کے مقابلے میں کافی اونچائی پر ہے۔پہاڑی راستے سے ہو کر

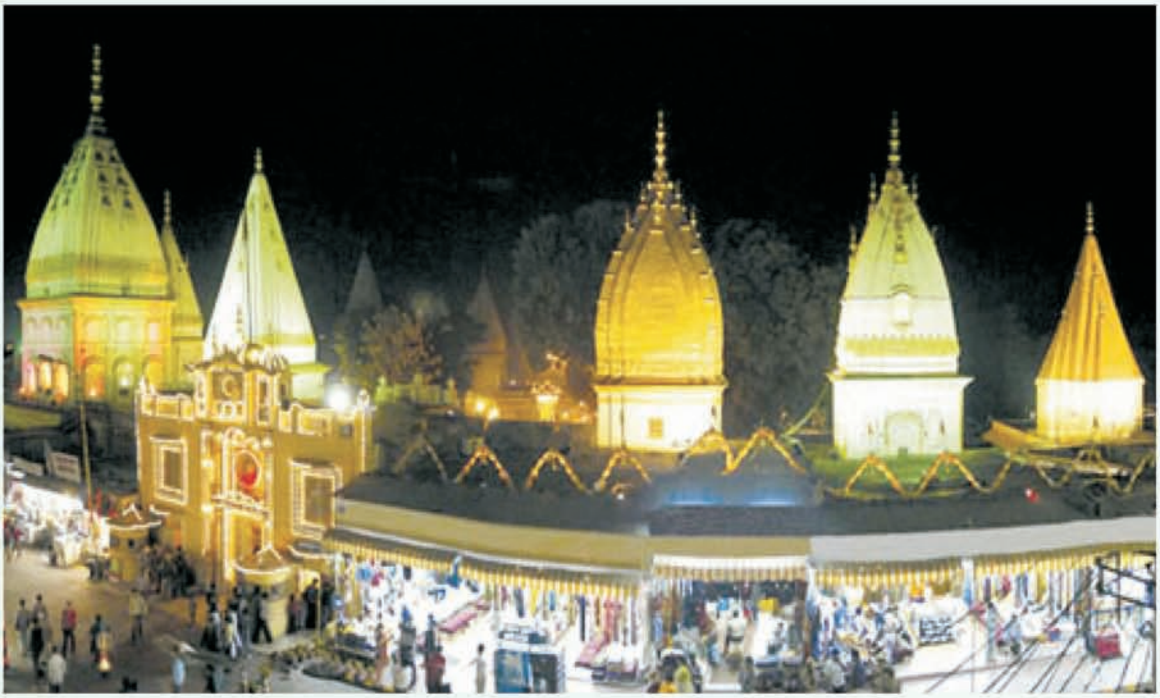

جب ٹیڑھی میڑھی سڑکوں سے ہو کر آپ جھیل کے قریب آجاتے ہیں تو لگتا ہے گویا آپ قدرت کو دیکھ رہے ہیں۔ لوگ جب جموں شہر آتے ہیں تو ان کی توجہ کا مرکز یا تو کٹرا میں بڑا ویشنو دیوی مندر ہوتا ہے یا پھر رگھوناتھ مندر راجہ اور پاس کے 12 اور مندر یا باہو قلعہ یا راجاؤں کے محل اور جموں کے دوسرے باغات (جن کے نام سب لوگ نہیں جانتے ہیں جو افسوس کی بات ہے) یہ کشمیر کی جانب سڑک کے راستے بھاگتے ہیں۔ جموں کے خوبصورت مقامات جن میں مانسر جھیل خاصی عمدہ و خوبصورت ہے۔ اس کی خاطر خواہ پبلسٹی نہیں کی جاتی۔ مانسر جھیل سے کافی چھوٹی ایک اور جھیل ہے 'سرنسار' جو جموں سے صرف 30 کلومیٹر دور ہے۔ یہ بھی خوبصورت ہے جس کے کنارے پتھر کی چھوٹی دیواروں سے گھرے ہیں۔ اتنی عمدہ جھیل بھی پبلسٹی نہ ہونے کی وجہ سے اتنی سنسان رہتی ہے کہ اوسطاً پانچ لوگ بھی ہر روز نہیں آتے ہیں گویا وہ جھیل اپنا نوحہ پڑھ رہی ہو۔ جو لوگ سیاحت کے کاروبار سے جڑے ہیں وہ ان جگہوں پر خصوصاً توجہ دیں جموں شہر اور اس کے نواحی علاقوں کی سڑکیں بہت عمدہ، چوڑی، مضبوط اور کشمیر کی سڑکوں سے بہت زیادہ بہتر ہیں انھیں سڑکوں سے پہنچنے لائق اتنی خوبصورت جھیلیں اور دوسرے عمدہ تفریحی مقامات بے توجہی کے شکار ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جموں و کشمیر کے تمام خوبصورت مقامات کے بارے میں نہ تو کوئی کتاب کہیں ہے اور نہ اسکولوں کی نصابی کتابوں میں ان کے بارے میں کچھ قاعدے سے پڑھانے کے لیے رکھا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو لداخ کی نوبرا گھاٹی میں موجود 64 عدد دو کوہان والے لال رنگ کے گھنے بالوں والے خوبصورت اونٹوں کے بارے میں لوگ

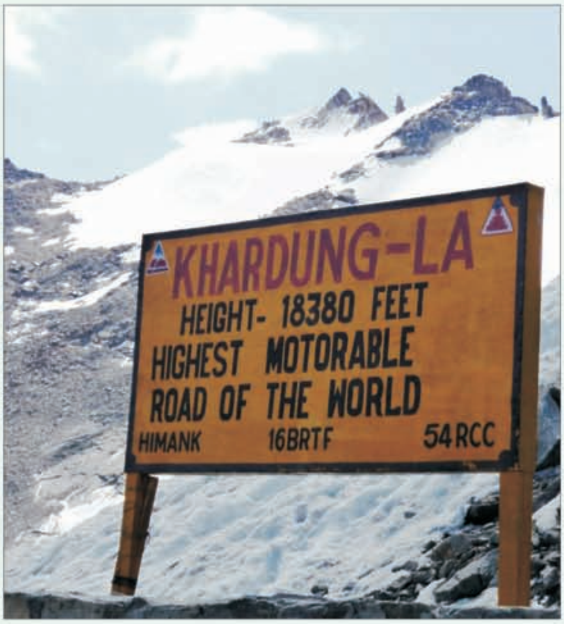

ضرور جانتے۔ یہ اونٹ اس برف جمے ٹھنڈے علاقے کی خصوصیت ہیں جو ختم ہو جانے کا خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔ انھیں معدوم ہونے سے بچانے اور ان کی تعداد بڑھانے کی شدید ضرورت ہے۔ ریاستی اور مرکزی حکومت اگر خصوصی توجہ دے تو وہ نایاب اونٹ بچ سکتے ہیں۔ پورے برصغیر ہی نہیں منگولیا میں بھی ایسے خوبصورت اور دو کوہان والے اونٹ جنھیں انگریزی میں بیکٹرین کیمل کہتے ہیں کہیں نہیں ملیں گے۔ اگر ان کے دودھ سے بنی عمدہ چائے پی لیں تو آپ محسوس کریں گے کہ بیماریوں سے لڑنے کی بڑی طاقت آپ کے بدن میں پیدا ہو گئی ہے۔ نوبرا گھاٹی لیہہ، لدّاخ سے ڈیڑھ سو کلومیٹر دور شمال میں ہے۔ وہاں جانے والی واحد سڑک کے راستے میں سفید رنگ کی برف سے بنا خوبصورت درّہ کھر دنگ لا (KHARDUNG LA) پڑتا ہے جو سطح سمندر سے ہزاروں فٹ اوپر ہے۔

Salahuddin Ahmad
Mumbai 400094

پانچویں قسط

اُلٹا دَرَخُت

□ کرشن چندر

اب تک آپ نے پڑھا کہ ایک موچی کا تھوڑا سا بے وقوف مگر منھ پھٹ اور بے روزگار بیٹا یوسف اپنی ماں کے کہنے پر بادشاہ کے پاس کام مانگنے گیا تو ہکلے اور ظالم بادشاہ نے اس کے خوب صورت باغیچے پر ہی قبضہ کرلیا۔ وہاں ایک نک چڑھی شہزادی ملی۔ اس نے یوسف کی ماں کا کنواں چھین لیا۔ اب غریب یوسف کے پاس ماں کے علاوہ ایک جھونپڑی اور ایک گائے رہ گئی۔ ماں نے کہا گائے بیچ دو ورنہ بھوکے مر جائیں گے۔ بازار میں ایک شخص نے اسے صرف تین بیج دے کر گائے لے لی اور کہا یہ بیج ایک ساتھ بوئے گا تو ایک ایسا درخت اگے گا جس کی اونچائی آسمان تک ہوگی۔ ان میں سے

دو بیج ضائع ہو گئے۔ یوسف بڑا پریشان ہوا اور اس نے بچا ہوا بیج باغیچے کی زمین میں دبا دیا۔ رات کو خوب بارش ہوئی اور صبح اٹھا تو اس نے دیکھا کہ بیج والی زمین میں ایک عجیب درخت اگا تھا جس کی جڑیں زمین پر تھیں اور تنا اور شاخیں زمین کے اندر اتر رہی تھیں۔ ماں کے منع کرنے پر بھی یوسف اس درخت پر نیچے کی طرف چڑھنے لگا۔ کافی نیچے اترنے پر وہ آوازوں کے ایک شہر میں پہنچ گیا۔ ایک سرگوشی جیسی آواز نے اسے شہر کی کہانی سنائی اور بتایا کہ یہاں تمام آوازوں کو آسمان جتنے اونچے گنبد میں قید کر لیا گیا ہے۔ مگر ان قیدی آوازوں نے وہاں سے بادشاہ کے محل تک ایک سرنگ بنائی اور اس میں فتیلہ بن کر گھس گئیں۔ یوسف کا کام تھا اس فتیلے کو آگ لگانا۔ اس نے فتیلے کو آگ دکھائی اور تیزی سے الٹے درخت پر جا پہنچا۔ کچھ ہی دیر میں آوازوں کا شہر تباہ ہو گیا اور یوسف درخت پر نیچے چڑھنے لگا۔ تین دن تین رات چڑھنے کے بعد اندھیرے میں کسی نے اسے درخت سے اتار لیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اسے اپنی مٹھی میں دبائے ہوئے ہوا میں اڑ رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس ہاتھ نے اسے ایک بہت بلند اور بڑے دروازے پر اتار دیا۔ یہ دروازہ اتنا بڑا تھا کہ ایک دیو بھی اس کے نیچے سے آسانی سے نکل سکتا تھا۔ یوسف تو خیر آدمی تھا۔ بڑی آسانی سے اندر چلا گیا۔ دروازے کی محراب پر لکھا تھا: کالے دیو کا شہر۔ یوسف درخت پر چڑھتا یا یوں سمجھ لو کہ زمین کے اندر اترتا چلا گیا جہاں ہر منزل پر اسے ایک نئی دنیا ملی...

بہت دیر تک یوسف، موہن اور مس ڈبل روٹی درخت کے اوپر چڑھتے رہے۔ یوسف موہن کی ٹارچ سے راستہ دیکھتا جا رہا تھا۔ آخر ایک جگہ پر جا کر یوسف رک گیا۔ درخت کی ایک بہت بڑی شاخ پر ایک بہت بڑا بورڈ لگا تھا۔ اس پر موٹے موٹے حرفوں میں لکھا تھا۔

"خبردار! اندر قدم نہ رکھنا۔ یہ سانپوں کا شہر ہے۔"

"اوئی!" شہزادی زور سے چلائی۔ "بھئی مجھے سانپوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔"

"مجھے بھی" موہن بولا۔ "چلو آگے چلو۔"

یوسف نے کہا "نہیں! اندر چلو۔ یہ شہر بھی دیکھ کر جائیں گے۔"

درخت کی شاخ پر چلتے چلتے وہ تینوں شہر کے دروازے پر پہنچ گئے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ یوسف کے کھٹکھٹانے پر ایک پہرے دار نے کہا۔

"اگر جان کی امان چاہتے ہو......"

یوسف نے ٹوک کر کہا "ہم نہیں چاہتے۔"

پہرے دار نے کہا "تمھارا بھلا اسی میں ہے کہ لوٹ جاؤ۔"

"آؤ جی!" یوسف نے موہن اور شہزادی کو ہاتھ سے پکڑا اور دروازے کے اندر داخل ہو گیا۔ ان کے اندر داخل ہوتے ہی پہرے دار نے پہلے تو ان کی اچھی طرح تلاشی لی اور پھر جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔ یہ بڑا خوبصورت شہر تھا۔ گلیاں، مکان، بازار، سڑکیں سب پکی تھیں۔ سیمنٹ اور کنکریٹ کی بنی ہوئی۔ صفائی اس قدر تھی کہ کہیں پر ایک تنکا بھی پڑا نظر نہیں آتا تھا۔ لوگ صاف ستھرے کپڑے پہنے گھوم رہے تھے۔ مگر سب خاموش سے، ہراساں، نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے

چل رہے تھے۔ کسی کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ دوکانداروں نے دوکانوں کے سامنے لوہے کی جالیاں لگا رکھی تھیں اور ان کے پیچھے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ گاہک آتا اور سودا طلب کرتا تو لوہے کی ایک چھوٹی سی جھری کھلتی اور دوکاندار کا ہاتھ اس میں سے باہر نکلتا۔ سودا دے دیتا۔ پیسے لے لیتا اور پھر یہ لوہے کی جھری کھٹ سے بند ہو جاتی۔ بڑی عجیب بات یہ تھی کہ صرف دوکانوں ہی پر لوہے کی جالیاں نہ تھیں بلکہ ہر گھر کے دروازے پر، ہر گلی کے موڑ پر، ہر مکان کی کھڑکی پر لوہے کی جالی تھی۔

''وہ دیکھو، وہ کیا ہے۔'' موہن نے اوپر آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یوسف سے کہا۔ یوسف نے سر اونچا کر کے دیکھا۔ شہر کے اوپر بھی، سب سے اونچی عمارت کے اوپر، بہت اوپر، ایک لوہے کی جالی لگی ہوئی تھی۔ یہ لوہے کی جالی سارے شہر کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔

یوسف نے کہا ''عجیب شہر ہے یہ؟''

شہزادی نے کہا ''سب سے عجیب بات یہ ہے کہ ہمیں اتنی دیر ہوگئی اس شہر میں گھومتے ہوئے، ہم نے کہیں پر ایک درخت تک نہیں دیکھا، ایک جھاڑ، ایک باغ، ایک پھول، کچھ بھی تو نہیں دیکھا۔''

اب جو یوسف اور موہن نے غور کیا تو انھیں بھی یہ بات

بڑی عجیب لگی۔ سچ مچ سارے شہر میں ایک درخت نہ تھا۔ ایک باغ نہ تھا۔ ایک پھول تک نظر نہ آتا تھا۔

''ماجرا کیا ہے؟'' یوسف نے بڑی حیرت سے کہا۔ اس نے اردگرد چلتے ہوئے لوگوں سے بھی کئی بار پوچھا۔ مگر کسی نے اس کے سوال کا جواب نہ دیا۔ بلکہ سوال سنتے ہی لوگ کانپنے لگتے، ان کا چہرہ زرد ہوجاتا اور وہ خاموشی سے سر جھکائے آگے بڑھ جاتے۔

''ضرور کوئی بات ہے۔'' یوسف نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

موہن نے کہا ''چلو یہاں سے بھاگ چلیں۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنا شہر یاد آتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں لوگ نہیں تھے، یہاں لوگ ہیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔''

یوسف نے کہا ''نہیں نہیں اب آئے ہیں تو معلوم کر کے ہی جائیں گے۔'' شام کو یہ تینوں ساتھی تھک کر ایک سرائے میں جا ٹھہرے۔ مگر یہاں بھی ان کی اچھی طرح تلاشی لی گئی۔ یوسف کے سوال کرنے پر بھی سرائے والے نے نہ بتایا کہ وہ کیوں ان کی تلاشی لے رہا ہے۔

کمرے میں پہنچ کر یوسف نے دیکھا کہ لوہے کے پلنگ پر لوہے کے نہایت ہی باریک تاروں کا بنا ہوا بستر لگا ہے۔ تکیہ، چادریں، غلاف ہر چیز لوہے کے باریک تاروں سے بنی ہوئی تھی۔ بستر اس انداز کا بنا ہوا تھا کہ آدمی بستر میں گھس کے اوپر سے لوہے کی زِپ لگا کر اطمینان سے اس کے اندر اس طرح سوجاتا تھا جیسے آدمی کسی لوہے کے پنجرے میں سو رہا ہو۔

''عجیب شہر ہے یہ۔''

شہزادی نے کہا ''مجھے تو پیاس لگی ہے۔''

یوسف نے ادھر ادھر دیکھا۔ آخر اسے ایک کونے میں پانی کا نل نظر آیا۔ نل کی ٹوٹی پر بھی لوہے کی چھلنی لگی تھی۔ جس میں سے پانی چھن کر آتا تھا۔ شہزادی نے پانی پیا۔ خیر ہوئی کہ پانی لوہے کے باریک تاروں کا بنا ہوا نہیں تھا۔ ورنہ شہزادی کے حلق میں ہی پھنس جاتا۔

شام کے وقت جیوں ہی سورج غروب ہوا، ان تینوں ساتھیوں نے دیکھا کہ سارے شہر میں سورج کی طرح چمکتی

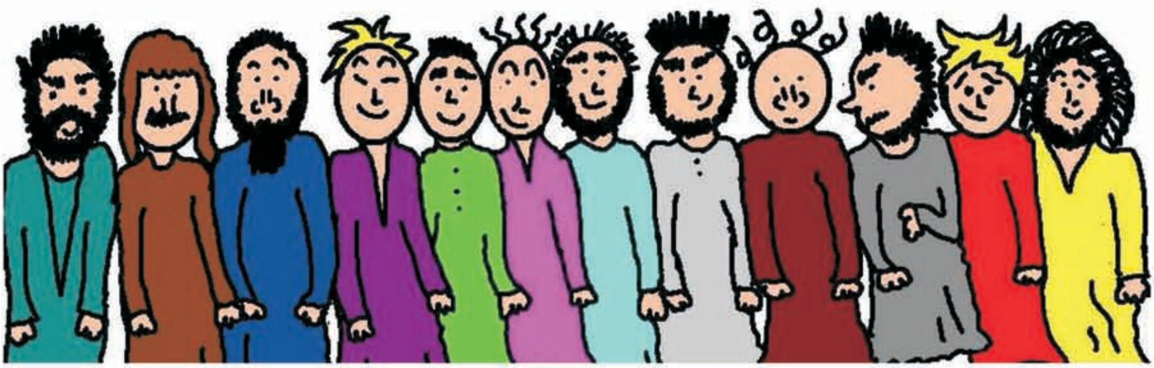

ہوئی ایک نئی روشنی پھیل گئی۔ روشنی اس قدر تیز تھی کہ شہر کا کوئی کونا اس سے محفوظ نہ تھا۔ کہیں پر اندھیرا نہ رہا۔ باہر کی سڑک آئینہ کی طرح چمک رہی تھی۔ اس پر اگر ایک بال بھی پڑا ہوتا تو صاف نظر آ جاتا۔

''یہ روشنی کہاں سے آ رہی ہے؟'' یوسف نے پوچھا۔

موہن نے باہر کی کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا ''وہ دیکھو۔''

''کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ چھت کی طرف دیکھو۔'' شہزادی نے کہا۔

وہ تینوں چھت کی طرف دیکھنے لگے۔ سرائے کی چھت شیشے کی بنی ہوئی تھی اور اس میں سے روشنی چھن کر اندر آ رہی تھی۔ روشنی ایک بہت بڑے مینار کے اوپر سے آ رہی تھی جس کے اوپر ایک سورج کی طرح چمکنے والا گولا گھوم رہا تھا۔

یوسف نے کہا ''اس روشنی میں سوئیں گے کیسے؟''

شہزادی نے کہا '' بڑی آسان بات ہے، اپنے ہاتھ آنکھوں پر رکھو اور سو جاؤ۔''

پھر تینوں نے ایسا ہی کیا، اپنے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھے اور سو گئے۔ یکا یک آدھی رات کے وقت کہیں سے زور کی چیخ بلند ہوئی۔ شہزادی ہڑبڑا کے جاگ اٹھی۔ اس نے موہن کو جگایا۔ موہن نے یوسف کو، یوسف نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

''کیا ہے بھئی! سونے بھی نہیں دیتے؟''

''اٹھو! اٹھو یہ چیخیں سنتے ہو؟''

سچ مچ سرائے کے باہر چیخوں کی آواز بڑھتی جا رہی تھی۔ اب اس میں عورتوں اور مردوں اور بچوں کے رونے کی آواز بھی شامل ہوگئی تھی۔ یوسف، موہن اور شہزادی جلدی جلدی اٹھے اور سرائے کے باہر گئے۔

سرائے کے باہر سڑک پر لوگوں کی بڑی بھیڑ تھی۔ مگر اس بھیڑ میں ہر شخص رو رہا تھا اور اپنی چھاتی کوٹ رہا تھا۔ آگے

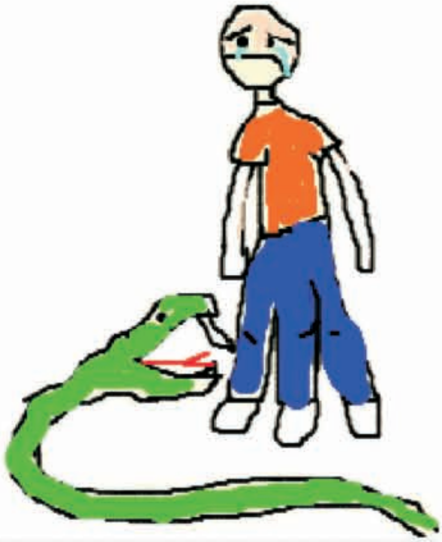

آگے کچھ لوگ دس صندوقوں کو اپنے سر پر اٹھائے چل رہے تھے۔ سچ مچ لوگ رو رہے تھے۔

''بھئی ان صندوقوں میں کیا ہے؟'' یوسف نے ایک آدمی سے پوچھا۔

''ہش ! آہستہ بات کر۔ ان صندوقوں میں ان خوش نصیبوں کی لاشیں ہیں، جنھیں آج رات شری سانپ جی مہاراج نے ڈس لیا ہے۔''

''سانپ نے ڈس لیا ہے؟''

''ششش!'' اس آدمی نے آہستہ سے کہا ''سانپ نہیں شری سانپ جی مہاراج کہو۔ اگر کہیں انھوں نے سن لیا تو خفا ہو جائیں گے۔''

''کون خفا ہو جائیں گے؟''

''شری سانپ جی مہاراج۔ اور پھر مجھے ڈر ہے کہیں وہ تم کو بھی ڈس کر خوش نصیب نہ بنا دیں۔''

''سانپ کے کاٹے سے آدمی خوش نصیب بن جاتا ہے۔ وہ تو مر جاتا ہے۔'' شہزادی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں مر جاتا ہے مگر یہاں ہم لوگ اس کو خوش نصیب کہتے ہیں کیونکہ اس شہر پر شری سانپ جی مہاراج کا راج ہے، اور ہر روز رات کو دس آدمی ان کے کاٹنے پر مر جاتے ہیں۔ میرا مطلب ہے خوش نصیب بن جاتے ہیں۔''

''تو تم اس کم بخت سانپ کو مار کیوں نہیں دیتے۔''

''ششش کیا بات کرتے ہو۔'' اس آدمی کا رنگ پیلا پڑ گیا اور یوسف، موہن اور شہزادی کو وہیں چھوڑ کر، بھیڑ میں شامل ہو کر، سر پر خاک ڈال رونے اور چیخنے لگا۔

بھیڑ بڑھ رہی تھی۔ لوگ جلوس میں شامل ہو کے روتے دھوتے جاتے تھے۔ کالے صندوق پر کالی چادریں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ صندوق بہت بڑے بڑے تھے۔ ایک صندوق کو بارہ آدمی مل کر اٹھاتے تھے، تب کہیں ایک صندوق اٹھتا تھا۔

''کیا یہ صندوق بہت بھاری ہیں؟'' موہن نے ایک آدمی سے پوچھا۔

''ہاں ہر صندوق میں مرنے والے کی ساری دولت رکھی ہوئی ہے۔ اشرفیاں، سونا چاندی، ہیرے جواہرات، مکان کا قبالہ۔ زمین کی ملکیت کے کاغذات۔''

''وہ کیوں؟''

''یہاں یہ دستور ہے کہ جب کوئی سانپ، میرا مطلب ہے۔ شری سانپ جی مہاراج، کے کاٹے سے مر جاتا ہے تو سرکاری قانون کی رو سے اسے اس کالے بکس میں ڈال دیا جاتا ہے اور اس کی ساری دولت اس صندوق میں رکھ کر وہ سامنے اونچا مینار جو دیکھتے ہو نا۔ وہاں پہنچا دیتے ہیں۔''

''کیوں؟''

''اسی مینار کے اندر ہماری سرکار رہتی ہے اور یہ اس کا قانون ہے۔''

''عجیب قانون ہے، مرنے والے کے بعد اس کی ساری دولت بھی لے لی جاتی ہے؟''

''ہاں! مگر شہر کو بچانے کے لیے خرچ بھی تو کتنا ہوتا ہے؟'' اس آدمی نے کہا ''یہ بھی تو سوچو یہ مینار کے اوپر جو روشنی کا گولا ہے۔ اس کی بجلی پر لاکھوں روپیہ خرچ ہو جاتے ہیں۔ پھر شہر کے اوپر اور چاروں طرف لوہے کے تاروں کا جال لگایا گیا ہے۔ تاکہ سانپ یعنی شری سانپ جی مہاراج اندر نہ گھس سکیں۔ سارے شہر کے درخت بھی کاٹ ڈالے گئے ہیں تاکہ کہیں شری سانپ جی مہاراج کے چھپنے کے لیے جگہ باقی نہ رہے۔ تم نے سارے شہر میں کوئی درخت نہ دیکھا ہوگا۔''

''ہاں بڑی عجیب بات ہے۔'' شہزادی نے کہا ''کوئی درخت جھاڑی یا پھول تک نظر نہ آیا۔''

''یہ سب شری سانپ جی مہاراج سے بچنے کے لیے کیا گیا ہے۔ تمام سڑکیں، سارے مکانات، گلیاں، کوچے بازار، سب پکے بنے ہوئے ہیں۔ تمام نالیاں زمین دوز ہیں اور ان کے منہ پر لوہے کی باریک جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ شہر کی سرکار نے اس آفت سے بچنے کے لیے ہر طرح سے انتظام کر رکھا ہے۔ پھر بھی ہر روز دس آدمی شری سانپ جی مہاراج کے کاٹے سے مر جاتے ہیں۔''

''کیا یہ سانپ کسی کو نظر نہیں آتا۔ کیا بات ہے کہ اس قدر روشنی ہوتے ہوئے بھی آپ اس سانپ کو مار نہیں سکتے؟'' یوسف نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ہش! ایسی بات نہ کرو۔ وہ سن لیں گے تو تمھیں بھی

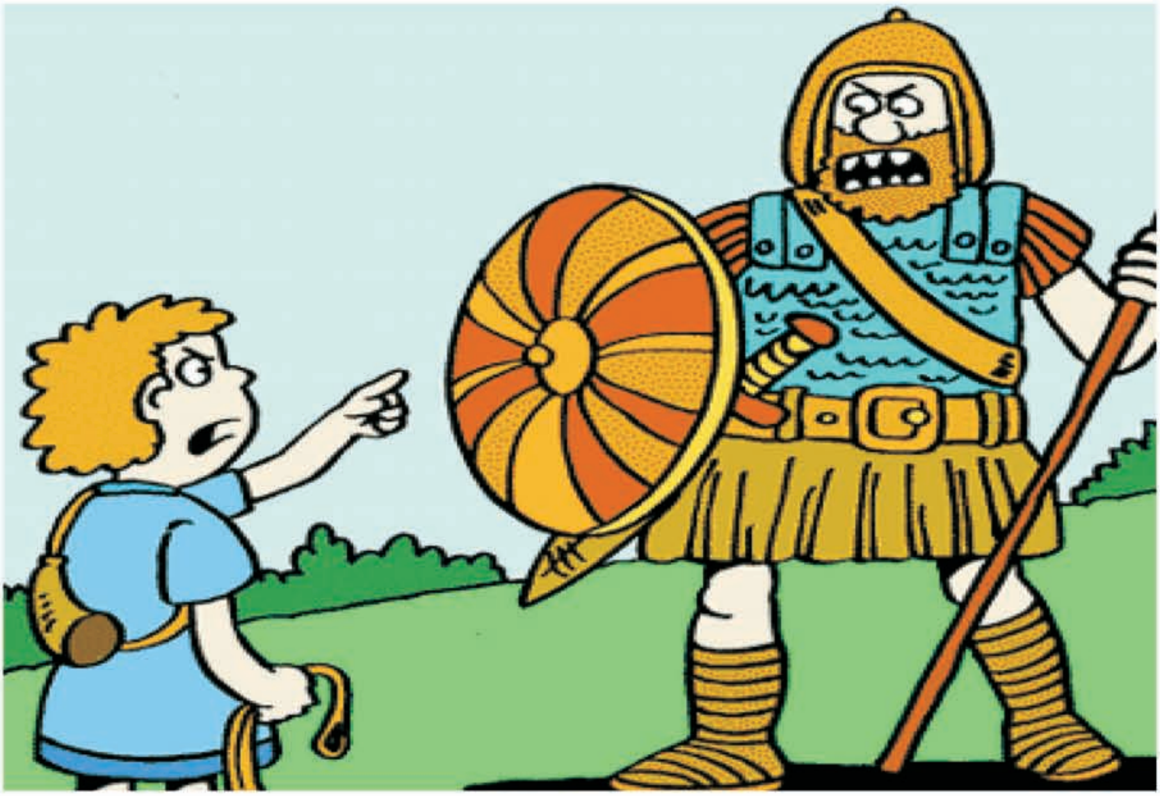

ڈس لیں گے۔"

اس آدمی کے چہرے پر یکایک زردی سی پھیل گئی اور وہ بھی بھاگ کھڑا ہوا اور بھیڑ میں جاتے ہی چکرا کر گر پڑا اور زمین پر تڑپنے لگا۔ "کاٹ کھایا، مجھے بھی سانپ جی مہاراج نے کاٹ کھایا۔" لوگ زور زور سے چلانے لگے۔ عورتوں نے بال کھول کر، اپنے سروں میں خاک ڈال کر، بین کرنا شروع کر دیا۔ یوسف، موہن اور شہزادی بھاگ کر اس آدمی کے پاس پہنچے، مگر وہ ان کے آتے آتے ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس کے ماتھے پر سانپ کے ڈنک کا نیلا نشان تھا۔ مگر سانپ کا کہیں پتہ نہ تھا، کہاں سے آیا۔ کدھر غائب ہوگیا۔ جلدی سے ایک کالا صندوق لایا گیا اور اس آدمی کی لاش کو بھی اس میں بند کر دیا گیا۔ یکا یک ایک زور کی آواز بادل کی طرح گرج کر بولی۔

"ڈرو۔ شہر کے باسیو، شری سانپ جی مہاراج کے قہر سے ڈرو۔ جو کوئی ان کی مخالفت کرے گا، اسے اس آدمی کی طرح موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔"

"نہیں نہیں، ہم آپ کے تابعدار ہیں۔ غلام ہیں۔" مرد عورتیں بچے سب زمین پر جھک کر گڑگڑانے لگے۔

صرف یوسف، شہزادی اور موہن کھڑے رہے۔

ایک آدمی نے کہا۔ "جھکو جھکو۔ تم لوگ بھی جھک جاؤ۔"

"واہ، ہم کیوں جھکیں؟" یوسف نے کہا۔

"ہم کسی کم بخت سانپ کے سامنے نہیں جھکتے۔"

"ڈرو۔ ڈرو۔" وہ غیبی آواز پھر ادھر سے آئی۔ "شری سانپ جی مہاراج کے قہر سے ڈرو۔"

لوگ زور زور سے رونے لگے اور صندوق کو آگے کر کے چلنے لگے۔ جب وہ مینار کے بہت قریب آ گئے تو ایک لوہے کے جنگلے کے پاس آ کے رک گئے۔ یہاں پر لکھا تھا۔

"آگے جانا منع ہے"

لوگوں نے کالے صندوق کو یہیں رکھ دیا اور باادب کھڑے ہو کر مینار کی طرف دیکھنے لگے۔ اونچے مینار کے لوہے کے پھاٹک بند کے بند رہے، مگر مینار کے اوپر سے آواز

آئی ''شہریو، اپنے اپنے گھر لوٹ جاؤ۔ہم ان لاشوں کو بجلی سے جلادیں گے اوران کی دولت کوتمہارے فائدے اورآرام کے لیےخرچ کریں گے۔گھبراؤنہیں۔ایک نہ ایک دن یہ زہر اس شہرسے دور ہوگا۔ہم ہرطرح کی کوشش کرتے ہیں کہ تمھیں شری سانپ جی مہاراج نہ ڈسیں۔اس کے لیے، ہراحتیاط عمل میں لائی جاتی ہے۔مگر افسوس ہے کہ ابھی تک ہم اس میں کامیاب نہیں ہوسکے۔شاید خدا کی مرضی ہی ایسی ہے،اورشری سانپ جی مہاراج کے زہر میں کس کو دخل ہے۔جاؤ میرے بیٹو!واپس جاؤاپنے گھروں کولوٹ جاؤ۔''

موہن نے پوچھا''یہ کس کی آواز ہے؟''

''یہ ہماری سرکار کی آواز ہے۔''

''توسرکار مینار کے باہرآکے کیوں بات نہیں کرتی؟''

''شری سانپ جی مہاراج کے ڈر سے۔''

''سرکار کی شکل کیسی ہے؟''

''سرکار کوکسی نے نہیں دیکھا۔نہ ان کے آدمیوں کو۔وہ سب لوگ مینار کے اندرہی رہتے ہیں،اور باہر نہیں آتے،ان کی ضرورت کی سب چیزیں یہیں لاکررکھ دی جاتی ہیں۔''

''جاؤ!جاؤ۔میرے بیٹو۔فوراًواپس چلے جاؤ۔''

سب لوگ واپس چلے گئے۔صرف یوسف، موہن اور شہزادی وہیں کھڑے رہے۔

موہن نے یوسف سے کہا''چلوہم بھی واپس سرائے میں چلیں۔''

یوسف نے کہا ''میں تو سرکار کی صورت دیکھ کے جاؤں گا۔''

سرکار کی صورت توشہر میں آج تک کسی نے نہیں دیکھی۔ تم کیسے دیکھوگے؟''

''میں دیکھنا چاہتاہوں یہ صندوق اندر کیسے لے جاتے ہیں۔''

یوسف نے ایک صندوق کھول کر دیکھنا چاہا کہ ایک گرجدار آواز آئی ''خبردار جوان صندوقوں کو ہاتھ لگایا۔واپس جاؤ۔اجنبیو، واپس جاؤ۔''

شہزادی نے کہا'' چلو یوسف یہاں سے بھاگ چلیں، مجھےتو بڑاڈر لگ رہاہے۔''

''اور مجھے بھی''یوسف نے کہا۔

یوسف اورموہن اورشہزادی تینوں واپس ہوئے۔مگر ایک مکان کی اوٹ پاتے ہی یوسف پھرکھڑاہوگیا۔اور بولا''میں تو یہ تماشہ دیکھ کرہی واپس جاؤں گا۔''

موہن اورشہزادی نے بہت سمجھایا۔مگر یوسف نہیں مانا۔

ایک گھنٹہ تک یوسف اورموہن اورشہزادی مکان کی اوٹ میں کھڑے مینار کی طرف دیکھتے رہے، مگر کچھ نہ ہوا۔ مینار کا پھاٹک بند رہا اور کالے صندوق آہنی جنگلے کے پاس دھرے رہے۔آخر ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد یکا یک مینار کے اوپر بجلی کے گولے کی روشنی یکا یک بجھ گئی اورسارے شہرمیں اندھیرا چھا گیا، اور چاروں طرف سے لوگوں کی چیخ وپکار اور ہائے وائے سنائی دینے لگی۔

یوسف نےشہزادی کاہاتھ موہن کے ہاتھ میں دے کرکہا۔ ''تم لوگ یہیں کھڑے رہو۔میں مینار کےقریب جاکے دیکھتاہوں کیابات ہے۔''

شہزادی نے کہا''مت جاؤ یوسف،مت جاؤ۔''

یوسف نے کہا''جانا ضروری ہے۔میرا خیال ہے اس وقت اندھیرا ہےاوروہ لوگ صندوق اٹھارہے ہوں گے۔''

جاری...

ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی

مادری زبان

عالم صاحب بہت بااصول آدمی تھے۔ مرکزی سرکار میں آفیسر کے عہدہ پر فائز تھے۔ پٹنہ میں خدمت انجام دے رہے تھے۔ انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو اردو میڈیم سرکاری اسکول میں داخل کردیا تھا۔ ان کے آفس میں جیلانی نام کا ایک چپراسی تھا۔ اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کو انگلش میڈیم اسکول میں داخل کیا تھا۔ اس کا بچہ بہت ٹھاٹ باٹ سے آٹو رکشہ میں بیٹھ کر اسکول جاتا۔ صاف ستھرے استری کیے ہوئے کپڑے اور ٹائی لگا کر وہ آفیسر کا بیٹا معلوم ہوتا تھا جب کہ عالم صاحب کے بیٹے معمولی کپڑوں میں پیدل ہی اسکول جاتے تو خیال ہوتا کہ یہ کسی چپراسی کے بیٹے ہیں۔

عالم صاحب تو پختہ طبیعت کے مالک تھے۔ ان کو کچھ احساس نہیں ہوتا۔ لیکن ان کی بیگم اندر سے بہت کڑھتیں اور اپنے شوہر سے برابر شکایت کرتیں کہ دیکھئے یہ آپ کے آفس کا چپراسی اپنے بچہ کو انگلش میڈیم اسکول میں تعلیم دے رہا ہے۔

اس کا بیٹا آفیسر کا بیٹا معلوم ہوتا ہے۔ اور تم آفیسر ہو کر اپنے بچوں کو اردو میڈیم کے سرکاری اسکول میں پڑھاتے ہو۔ یہ تو خیراتی اسکول ہے۔ یہاں تو فقیروں کے بچے پڑھتے ہیں۔ جب تمہارے بچے پیدل اسکول جاتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی آفیسر کے بچے نہیں بلکہ کسی چپراسی یا فقیر کے بچے ہیں۔ افسوس ہے تم پر اور تمہارے بچوں پر۔ عالم صاحب ہنس کر ان باتوں کو ٹال دیتے اور بیگم کو سمجھانے کی کوشش کرتے کہ تعلیم خوب صورت پوشاک عمدہ سواری اور اونچی عمارت کا نام نہیں ہے۔ تعلیم تمام مضمون کو اچھی طرح سمجھ کر پڑھنے کا نام ہے۔ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے سے بچہ سمجھ کر پڑھتا ہے۔ تمام مضامین میں قابلیت حاصل کرتا ہے۔ ایسے بچے کی تعلیم کی بنیاد مضبوط ہوتی ہے۔ ایسا بچہ آگے چل کر بہت ترقی کرتا ہے۔ جب کہ مادری زبان کو چھوڑ کر دوسرے میڈیم میں تعلیم حاصل کرنے سے بچہ کو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ تمام مضمون کو صرف طوطے کی طرح رٹ لیتا ہے۔ اس کے اندر کوئی قابلیت پیدا نہیں ہوتی۔ ایسا بچہ آگے چل کر نہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتا ہے اور نہ اعلیٰ عہدہ پر پہنچ سکتا ہے۔ آج انگلش میڈیم اسکولوں کا یہی حال ہے۔ یہاں خوبصورت سبز اور سرخ طوطوں اور طوطیوں کو معلومات رٹائی جاتی ہیں۔

لیکن عالم صاحب کی بیگم پر ان باتوں کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ ان کو تو بہت غیرت محسوس ہوتی کہ ان کے بچے چپراسی کے بچے سے بھی بدتر حالت میں اسکول جاتے ہیں۔ کاش ان کے بچے بھی عمدہ لباس اور ٹائی لگا کر اسکول جاتے تاکہ معلوم ہوتا کہ واقعی آفیسر کے بچے ہیں لیکن یہاں تو معاملہ الٹا تھا۔ وہ برابر اپنے شوہر کے سامنے اپنے دل کا بخار نکالتیں اور انہیں کچو کے لگاتیں۔

ایک دن عاجز آ کر عالم صاحب نے اپنی بیگم سے کہہ دیا۔ تمہیں کیا پتہ ایک دن آئے گا کہ میرے بیٹے آفیسر ہو کر کار میں بیٹھیں گے اور جیلانی کا بیٹا ان کی کار چلائے گا۔ کچھ دنوں کے بعد عالم صاحب کا تبادلہ فرید آباد میں ہو گیا۔ فرید آباد میں ایک مدت رہنے کے بعد ان کا وظیفہ ہو گیا۔ وہ پٹنہ واپس آ گئے۔ ایک مرتبہ پٹنہ جنکشن پہ اترنے کے بعد انھیں رکشہ کی تلاش تھی۔ ایک لڑکا عالم صاحب کی بیگم کو چاچی چاچی کہتا ہوا رکشہ لے کر سامنے آ گیا اور ان کو سوار کر کے لے جانے لگا۔ راستہ میں لڑکے نے کہا۔ چاچی آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں جیلانی کا بیٹا ہوں۔ اب تم رکشہ چلا

رہے ہو؟ کیا بتاؤں چاچی میں میٹرک میں فیل ہوگیا۔ میرے ابا نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ ابا نے کہا: میں نے تمہیں کتنے شوق اور ارمان سے ہزاروں روپے دے کر انگلش میڈیم اسکول میں داخلہ دلایا تھا۔ اپنی آدھی سے زیادہ تنخواہ تمہاری اسکول فیس، یونی فارم اور آٹو کرایہ پر خرچ کی۔ تم نے اور تمہارے اسکول والوں نے مجھے دھوکہ دیا۔ تم نے میرے خواب چکنا چور کر دیے۔ میں تمہیں عالم صاحب کی طرح بڑا آفیسر بنانا چاہتا تھا۔ لیکن تم تو میٹرک بھی نہیں کر پائے۔ اب مجھے اپنی صورت نہیں دکھانا۔ اس لئے اب میں رکشہ چلا کر اپنی گزر بسر کرتا ہوں۔ اتنے میں گھر آ گیا۔ عالم صاحب نے اس لڑکے کو مٹھائی کھانے کے لئے زبردستی تیس روپے تھما دیئے۔

رکشہ سے اتر کر عالم صاحب کی بیگم نے عالم صاحب سے کہا۔ کیا آپ کی زبان پر کالا تل ہے؟ آپ کی بات بالکل صحیح ہوگئی۔ ہمارے بیٹے کیا، ہم خود جیلانی کے بیٹے کے رکشہ پر بیٹھے۔ اللہ کا شکر ہے کہ آج ہمارے دونوں بیٹے آفیسر ہیں بڑا بی۔ ڈی۔ او ہے اور چھوٹا رجسٹرار۔ مادری زبان میں دلائی گئی تعلیم اچھی اور بہتر تعلیم ہوتی ہے۔

Syed Asrarul Haque
Junior Lecturer, Govt. Junior College
Shadnagar, Mahbubnagar

ہنسی کے غبارے

استاد: اسلم! عین نوازش کو جملے میں استعمال کرو۔
اسلم: جناب اگر آپ ہر ہفتہ ہمیں چھ چھٹیاں دے دیا کریں تو آپ کی عین نوازش ہوگی۔

ایک چھوٹی بچی وکیل صاحب کے گھر گئی۔ وہاں اس نے جب ڈھیر ساری کتابیں دیکھیں تو کہنے لگی انکل کیا آپ بھی میرے ابو کی طرح لائبریری کی کتابیں واپس نہیں کرتے؟

پہلا دوست: یہ چیونٹیاں بھی عجب شئے ہیں بس ہر وقت کام میں لگی رہتی ہیں ان کی زندگی میں تفریح ہے ہی نہیں۔
دوسرا دوست: میں نہیں مانتا؟ ہم جب بھی پکنک پر گئے ہیں انہیں وہاں پہلے سے موجود پایا ہے۔

پہلا دوست: یار اس گاؤں کے لوگ تو بہت ہی گئے گذرے ہیں۔
دوسرا دوست کیوں بھئی کیا ہوا؟
پہلا دوست: میں نے بازار سے برف خریدی تو راستے میں چند دوست مل گئے میں برف ایک طرف رکھ کر باتیں کرنے لگا۔ گھنٹہ بھر میں دیکھا تو برف غائب تھی۔

باپ بڑے پیار سے۔ جاوید بیٹے کیا کررہے ہو؟
جاوید: کوئی خاص کام نہیں ابو صرف شرارتی مچھلیوں کو حوض سے باہر نکال رہا ہوں۔
باپ: غصّے میں۔ ایسا کیوں کررہے ہو؟
جاوید: امی نے کہا ہے زیادہ دیر نہانے سے زکام ہوجاتا ہے۔

باپ (بیٹے سے) بیٹا : ''اس بار امتحانوں میں 90%مارکس لانا''
بیٹا: ''نہیں ابّا100%لاؤنگا''
باپ: کیوں مزاق کررہے ہو؟''
بیٹا: ''تو ابّا جی شروع کس نے کیا تھا؟''

ایک دوست اپنے دوسرے دوست سے بولا ''میرے تین بیٹے ہیں ایک نے MA کیا ہوا ہے دوسرے نے Phd کیا ہوا ہے۔''
دوسرا دوست: ''اور تیسرا؟''
پہلا دوست: تیسرا چور ہے''
دوسرا دوست بولا: ''تو تم اس چور کو گھر سے نکال کیوں نہیں دیتے؟''
پہلا دوست: ''یار کیسے نکالوں ایک وہی تو کماتا ہے، باقی سب تو بے روزگار ہیں''

ملزم نے وکیل سے کہا: ''کوشش کرنا کہ مجھے عمر قید ہو جائے، مگر سزائے موت نہ ہو۔''
وکیل: ''تم فکر نہ کرو۔''
کیس کے بعد ملزم نے پوچھا: ''کیا ہوا؟''
وکیل: بڑی مشکل سے عمر قید ہوئی ہے، ورنہ عدالت تو رہا کر رہی تھی۔''

مومن محمد شاداب

کڑوا سچ

بہت دنوں کی بات ہے کسی شہر میں ایک آدمی رہتا تھا اس کا نام بھولا تھا۔ وہ بہت غریب تھا۔ اس کے پاس رہنے کے لیے گھر نہیں، پہننے کے لیے کپڑا نہیں۔ ایک طرح سے انسان کی بنیادی تینوں چیزیں اس کے پاس نہیں تھیں۔ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر ایک وقت کا کھانا کھا پاتا تھا۔ کبھی کبھی تو ایک وقت کھانا بھی اسے نصیب نہیں ہوتا تھا۔ بھولا کی حالت بد سے بدتر ہوگئی۔ وہ بہت اداس رہتا تھا۔ ایک دن اس نے سوچا کہ شہر میں اب رہنا بے وقوفی کی بات ہے۔ بھولا اس رات اپنا بوریا بستر باندھ کر اس شہر سے نکل کر دوسرے شہر چلا گیا۔

وہاں پہنچ کر وہ در بدر بھٹکتا رہا۔ بہت محنت کے بعد اسے نوکری ملی۔ وہاں اس نے بہت پیسہ کمایا اور اسی شہر میں لوٹا جہاں وہ پہلے رہتا تھا۔ لوگ اسے دیکھ حیران ہوگئے۔ اس شہر میں بھولا نے ایک اچھی خاصی بڑی زمین خریدی اور گھر کا کام شروع کروادیا۔ شہر میں سب لوگ اس سے گھل مل کر رہنے لگے۔ بھولا کا شمار شہر کے رئیسوں کی فہرست میں ہونے لگا۔ لوگ بھولا سے سلام دعا کرتے تھے۔ جب بھی لوگ اسے سلام کرتے تو بھولا کہتا کہ میں کہہ دوں گا۔ لوگ حیرت میں پڑ جاتے کہ یہ کیسے کہہ دے گا ہم تو سلام بھولا کو کرتے ہیں۔

ایک بار کسی رئیس کے یہاں شادی تھی۔ وہاں بھولا کو بھی دعوت دی گئی۔ وہاں بھولا اپنے پرانے اسٹائل میں گیا۔ نہ ناخن کٹے اور نہ بال کٹے اور پھٹے پرانے کپڑے۔ جب بھولا وہاں پہنچا تو لوگوں نے مار پیٹ کر بھگا دیا۔ بھولا نے اپنے گھر پہنچ کر ناخن کاٹا، بالوں کی حجامت بنوائی اور پھر واپس پہنچا تو اس کا استقبال پھولوں سے کیا گیا۔ بہت ادب واحترام سے اسے کرسی پر بٹھایا گیا۔ جب اسے کھانے پر بلایا گیا تو اس نے

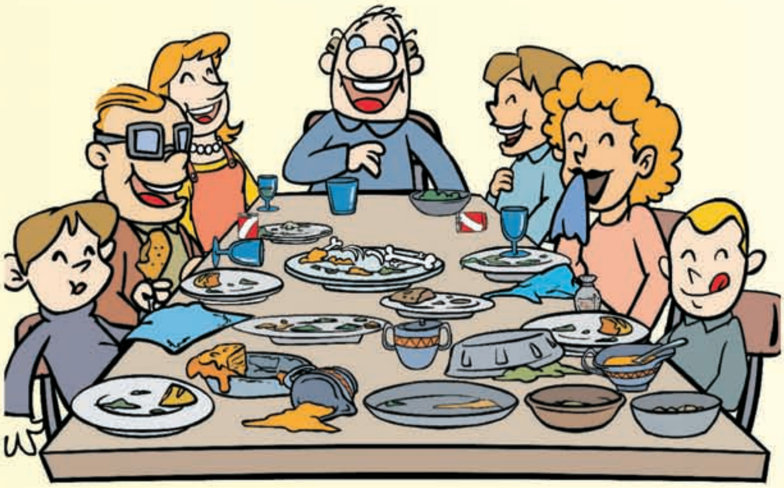

دیکھا کہ کھانے میں بہت ساری چیزیں ہیں۔ اس نے دال کا پیالہ اٹھایا اور اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر مل لیا۔ سالن کا پیالہ اٹھا کر سر سے پاؤں تک انڈیل دیا اور چاول اٹھا کر اپنی شرٹ اور پینٹ کی جیب میں بھر لیا۔ سب لوگ حیران ہو گئے۔ مجمع کے بیچ سے آواز بلند ہوئی کہ صاحب ہم کھانا آپ کے گھر بھیج دیں گے۔ پھر بھولا نے جواب دیا۔ بات وہ نہیں

ہے۔ کچھ دیر پہلے میں ہی آیا تھا تو لوگوں نے مجھے مار کر بھگا دیا تھا اور اچھے سوٹ بوٹ میں آیا ہوں تو میرا ادب واحترام کیا جا رہا ہے۔ اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ تم لوگوں نے میرے کپڑے کو دعوت میں بلایا ہے۔ اور ہاں جب تم لوگ مجھے سلام کرتے ہو تو میں گھر جا کر اپنے کپڑے کو سامنے ٹانگ کر کہتا ہوں کہ فلاں نے تم کو سلام کہا ہے۔

بھولا کی بات سن کر سب لوگ بہت شرمندہ ہوئے۔ بھولا وہاں سے نکل کر سیدھے اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔

Momin Mohd. Shadab Ibn Sameer Anwar
Class VIII
Anjuman Barul Uloom Urdu High School

مصباح شکیل

کہانی بہروں کی

ایک بہرے آدمی کے پاس بکریوں کا ریوڑ تھا۔اس ریوڑ کی چند بکریاں گم ہوگئیں جن کو تلاش کرتا ہوا وہ جنگل کی طرف چل پڑا۔اس نے ایک آدمی کو درخت کے نیچے سوتا دیکھ کر اسے جگایا اور پوچھا کہ میری بکریاں اس جنگل میں گم ہوگئی ہیں۔اگر تمھیں ان کا علم ہو تو ان کا پتہ بتا دو۔اتفاق سے وہ آدمی بھی بہرا تھا۔اس نے سوچا شاید راستہ بھول گیا ہے اس لیے اس نے جواب دیا کہ یہی راستہ ہے۔ریوڑ والے نے یہ سمجھا کہ میری بکریاں اسی راستے سے گذری ہیں اس کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑا اور اس نے اپنے دل میں کہا اگر مجھے میری بکریاں مل جائیں تو اس میں سے لنگڑی بکری اسے انعام کے طور پر دے دوں گا۔

الغرض اس آدمی کی گم شدہ بکریاں اسے مل گئیں تو وہ لنگڑی بکری اس آدمی کے حوالے کرنے آیا۔اس نے جواب دیا اے اللہ کے بندے میں نے تیری بکری کو لنگڑا نہیں کیا۔تو مجھے ناحق بدنام نہ کر۔وہ اسی بات چیت میں مصروف تھے کہ اچانک ایک آدمی گھوڑے پر سوار ہو کر آیا۔دونوں نے اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر اپنی اپنی بات بیان کی۔اتفاق سے گھوڑا سوار بھی بہرا تھا اس نے سمجھا کہ یہ دونوں میرے گھوڑے پر اپنا حق جتا رہے ہیں۔اس نے کہا کہ ارے یارو تم تو سراسر جھوٹا دعوی کر رہے ہو۔یہ گھوڑا تو میری گھوڑی کا بچہ ہے اور میں چند ایک گواہ بھی پیش کرنے کو تیار

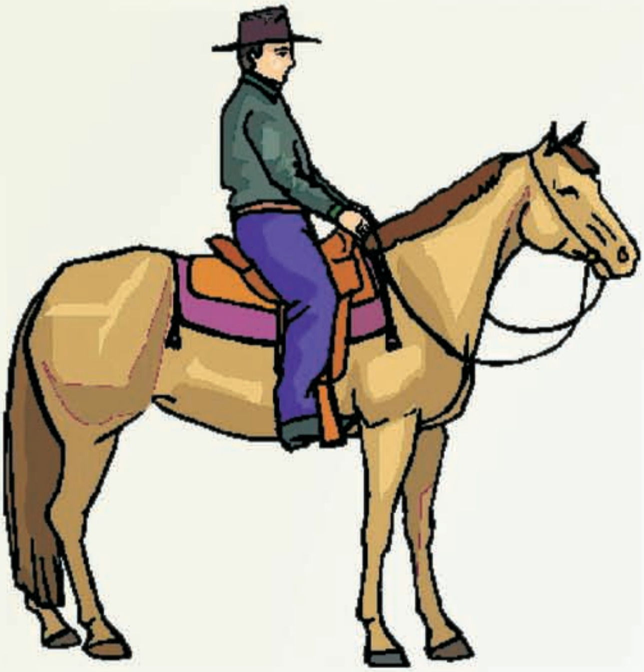

ہوں۔ میرے گھوڑے کی لگام چھوڑ دو تا کہ میں اپنی راہ لوں۔ اب دونوں نے اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر اپنا اپنا قصہ دہرایا تو گھوڑے کے مالک نے کہا ارے ظالمو اللہ سے ڈرو یہ گھوڑا تو میری گھوڑی نے جنم دیا ہے۔

آخر کار تینوں ایک ساتھ قاضی کے پاس چلے۔ ہوا یہ تھا کہ قاضی کی بیوی قاضی سے جھگڑنے کے بعد اپنے میکے چلی گئی تھی۔ جونہی یہ تینوں قاضی کے پاس پہنچے۔ اتفاق سے قاضی بھی بہرا تھا اس نے پوچھا کہو کیا حال ہے؟ تینوں نے باری باری اپنا حال بیان کیا۔ ان تینوں کی بات سن کر قاضی نے یہ خیال کیا ان تینوں میں سے ایک وکیل اور دو گواہ بن کر میری بیوی کی طرف سے آئے ہیں اور آپسی صلح کرانے کی فکر کر رہے ہیں۔ قاضی نے کہا تم ایک وکیل اور دو گواہ بن کر آئے ہو۔ اگر اب بھی میری بیوی سر سے لے کر پیر تک زر و جواہر سے لدی ہوئی بھی آئے تو میں اسے اپنی بیوی کے طور پر قبول نہیں کروں گا کیونکہ میں نے اسے تین طلاقیں دے دی ہیں۔

Miss Misbah Shakeel Zunjwadka
Urdu High School, Khanpur
Belgaum, Karnataka - 591302

اذکا مریم اختر، سینٹ جوزف اسکول، بجنور

فاریہ شیخ انیس، درجہ: سوم، میری انگلش میڈیم اسکول

کاشفہ عرفان احمد قریشی، درجہ: سوم، سینٹ میری انگلش میڈیم اسکول

عبدالرحمٰن، ڈاکٹر اقبال اردو ماڈل ہائی اسکول

شیخ عظمیٰ حنیف، درجہ: نہم، اینگلو اردو ہائی اسکول، نندوبار

ماریہ صدف شیخ فیروز، درجہ: ششم، سیونہ، سلّوڑ

Facebook اردو فیس بک

میں نگر پریشد اردو اسکول نمبر 4، مہکر میں تیسری جماعت میں پڑھتی ہوں۔ یوم مادری زبان کے موقع پر ہمارے اسکول میں پروگرام تھا۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر آصف صاحب اور راغب صاحب نے بچوں کی دنیا میگزین ہمیں دی۔ مجھے 'بچوں کی دنیا' بہت اچھی لگی گیت ماں تو آنسو پونچھ لے، بہت پیارا لگا اور مجھے یاد ہوگیا اور چور لڑکا کا سبق بھی اچھا لگا۔ میں بہت خوش ہوں کہ 'بچوں کی دنیا' میگزین اب میں ہمیشہ پڑھوں گی اور نئی نئی نظمیں یاد کروں گی۔

ثانیہ پروین شیخ جانی قریشی
نگر پریشد اردو اسکول نمبر 4، مہکر

مئی کا شمارہ ہر شمارے کی طرح خوب تھا۔ سرورق کی تصویر کافی دیدہ زیب تھی۔ مجھے بچوں کی دنیا کی ساری کہانیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ میں یہ رسالہ تقریباً ڈیڑھ سال سے پڑھ رہی ہوں۔ فسانہ عجائب میرا پسندیدہ سلسلہ تھا۔ مجھے مئی کے شمارے کی سبھی کہانیاں اور نظمیں کافی پسند آئیں۔ خاص طور پر حضرت علیؓ کے یوم ولادت پر ادارے کا شائع کردہ فرمایا حضرت علیؓ نے، فضول خرچی اور آج ہماری ٹیچر نے یہ بات ہمیں سمجھائی کافی سبق آموز تھی۔ اس کے علاوہ اردو فیس بک، ایس ایم ایس، کامکس اسٹوری، ننھے فنکار اور سائنس کی کہانی بہت عمدہ تھی۔

فردوسی عثمانی درجہ 9، عثمانیہ جونیئر ہائی اسکول،
سنکتوریہ دیشر گڑھ۔ محلّہ پیتانہ، کلٹی بردوان، مغربی بنگال

میرا نام مہ پارہ اختر ہے۔ میں کلاس VII میں پڑھتی ہوں۔ جب پہلی بار میرے پاپا نے مجھے ''بچوں کی دنیا'' لاکر دیا۔ میں نے صرف ایک گھنٹے میں پوری کتاب ختم کرڈالی۔ مجھے ''بچوں کی دنیا'' سے بہت لگاؤ ہے۔ اس کی تصاویر دل کو چھولیتی ہیں۔ مئی کا شمارہ جب میرے سامنے آیا تو میں نے سب سے پہلے حضرت علیؓ کے یوم ولادت پر ادارہ کا شائع کردہ فرمایا حضرت علیؓ نے بہت توجہ سے پڑھا۔ قسط وار داستان فسانہ عجائب مجھے بے حد پسند آیا۔ اس کے علاوہ اردو ایس ایم ایس، چھٹی کی گھنٹی، پھول جیسے تمام بچے، سائنس کی الف لیلہ مجھے پسند آئے۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ نے یہ ''بچوں کی دنیا'' دنیا کے تمام بچوں کے لیے نکال کر اردو کو اور بھی ترقی دی ہے۔ میرے گھر کے تمام لوگ اس رسالے کو بہت ہی دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

مہ پارہ اختر، درجہ 7 کلٹی ملت اردو گرلس ہائی اسکول
محلّہ پیتانہ، کلٹی بردوان، مغربی بنگال

میرا نام محمد زید شیخ صادق ہے۔ الحسنات پرائمری اسکول میں جماعت چہارم کا طالب علم ہوں۔ ہمارے اسکول میں ''بچوں کی دنیا'' کا بڑی بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔ تقریباً 50 کاپیاں آتی ہیں۔ محترم قاسمی

ہے۔ میں تمام اردو مدارس میں پڑھنے والے بچوں سے گزارش کروں گا کہ وہ ''اردو رسالوں'' کا خصوصاً ''بچوں کی دنیا'' کا پابندی سے مطالعہ کریں۔ اپنے پاکٹ منی میں سے دس روپے ضرور بچائیں اور بچوں کی دنیا کو مضبوط بنائیں۔

محمد زید شیخ صادق

الحسنات اردو اسکول، راویر۔ 425508

میں ماریہ صدف شیخ فیروز سلیم اردو ہائی اسکول ''سیونہ'' کی جماعت ششم کی طالبہ ہوں۔ مجھے آپ کے ادارہ سے نکلنے والا رسالہ 'بچوں کی دنیا' بیحد پسند ہے۔ اتنا اچھا رسالہ نکالنے کے لیے بہت بہت شکریہ۔ میں ''بچوں کی دنیا'' کا بے صبری سے انتظار کرتی ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے انکل کہ یہ ماہنامہ نہ ہو بلکہ پندرہ روزہ ہو۔ پہلے میں ''بچوں کی دنیا'' اسکول سے لیتی تھی اب اپنے ابا جان کے یہاں 'دیولگھاٹ' سے منگاتی ہوں۔ بچوں کی دنیا میں فیس بک، لطیفہ، نظم، کہانیاں پڑھ کر میں اپنی بہن کو سناتی ہوں جو کہ اردو نہیں جانتی۔ انکل میں نے ڈرائنگ بنائی ہے کیا آپ اسے بچوں کی دنیا میں جگہ دیں گے۔

ماریہ صدف شیخ فیروز

نورانی چوک، سیونہ، مہاراشٹر

☆ اگر آپ کی ڈرائنگ اچھی ہوئی تو ہم بچوں کی دنیا میں ضرور جگہ دیں گے۔ (ادارہ)

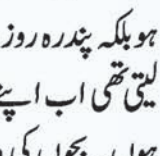

میں مریم صبا جماعت سوم میں پڑھتی ہوں۔ پہلی بار میں نے رسالہ بچّوں کی دنیا پڑھا۔ بڑا مزہ آیا۔ اس کی کہانیاں، نظمیں اور لطیفے اچھے لگے۔ رنگین تصویریں بہت پسند آئیں۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی ڈرائنگ بھی بھیجی ہے۔ امید کرتی ہوں کہ آپ کو پسند آئے گی۔

مریم صبا سیّد منظور

تاج نگر نمبر 1، امراوتی۔ 444601

میں محمد عمر درجہ سات کا طالب علم ہوں۔ مجھے بچّوں کی دنیا بہت اچھی لگی۔ اس میں سائنس کی الف لیلہ سب سے اچھی لگی۔ مئی 2015 میں میاں سیفان کی بکری جو میں درجہ 6 میں پڑھ چکا ہوں۔ اس میں اس کا نام ابّو خاں کی بکری تھا۔ مجھے کارٹون بنانے کا بہت شوق ہے اور میں بہت اچھے اچھے کارٹون بنالیتا ہوں۔

محمد عمر انصاری

درجہ۔ سات، محلّہ کوٹ مئو آئمہ، ضلع۔ الٰہ آباد

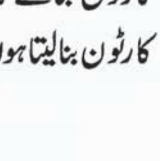

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' اپنی تمام تر رعنائیوں اور جاذب رنگوں کے ساتھ میرے سامنے ہے واقعی یہ رسالہ ''بچوں کی دنیا'' پیارے پیارے بچوں کو اردو دنیا میں لے جانے کے لیے اپنی خوبصورتی کی وجہ سے منفرد ہے۔ میں تقریباً دس گیارہ مہینے سے ہر مہینے پابندی سے پڑھتی ہوں۔

زیبا خانم محمد زاہد خان علیمی

تیلی گنیسڑی بازار، ضلع بلرام پور یوپی۔ 271210

ماہنامہ بچوں کی دنیا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ اس میں مزیدار کہانیاں اور نظمیں ہوتی ہیں۔ میں ہر مہینے بچوں کی دنیا کا انتظار کرتی ہوں۔

زینب ذکی

عمر۔ چھ سال، اے ایل این روڈ، مرار پور، گیا

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

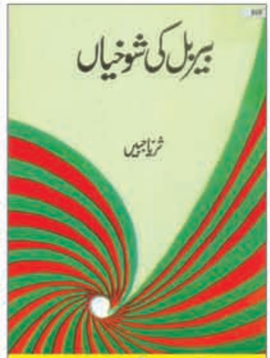

صفحات: 64، قیمت: 12 روپے

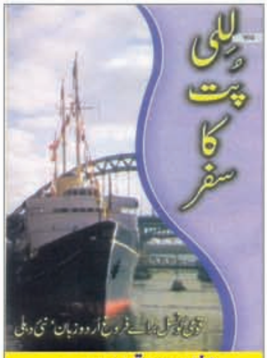

صفحات: 48، قیمت: 12 روپے

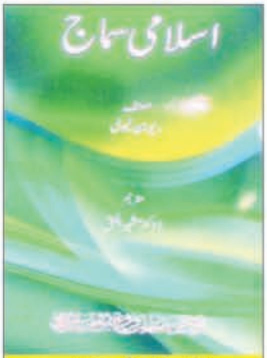

صفحات: 701، قیمت: 224 روپے

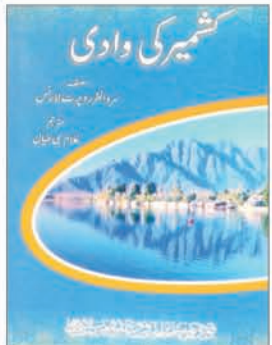

صفحات: 587، قیمت: 217 روپے

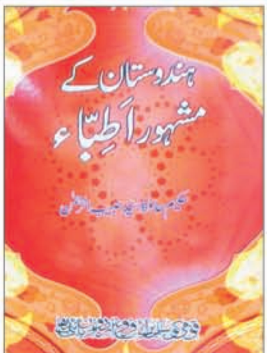

صفحات: 273، قیمت: 109 روپے

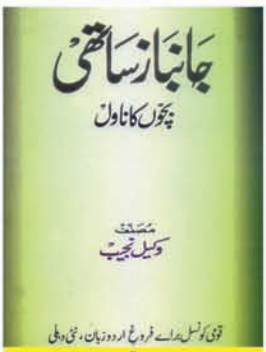

صفحات: 200، قیمت: 42 روپے

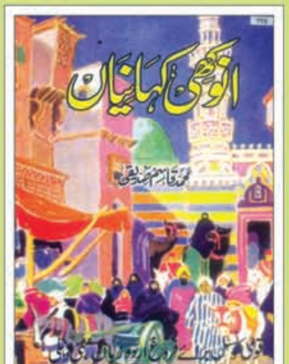

صفحات: 31، قیمت: 10 روپے

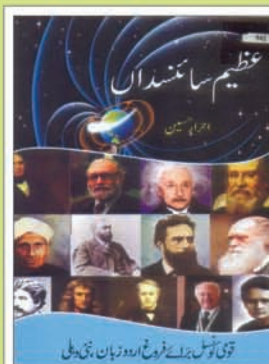

صفحات: 83، قیمت: 15 روپے

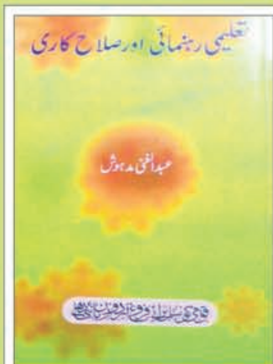

صفحات: 273، قیمت: 109 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی - 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

BACHON KI DUNIYA Monthly, October 2015, Vol. 03, Issue: 10
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439-2013-15
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/9/15
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025 and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor : Prof. Syed Ali Karim, Tel : 49539000